معارف اسلامیہ کا ترجمان

سہ ماہی

صدائے ثقلین

لندن

مجمع اہل بیتؑ برطانیہ

اکتوبر تا دسمبر 2014ء | 22 | جلد 6 | شمارہ 2

نظارت

حجۃ الاسلام والمسلمین ڈاکٹر محمد علی شمالی

مدیر

جعفر علی نجم

مجلس تحریر

حجۃ الاسلام مولانا محمد حسن معروفی (لندن)

حجۃ الاسلام مولانا سید علی رضا رضوی (لندن)

حجۃ الاسلام مولانا سید فدا حسین بخاری (مانچسٹر)

حجۃ الاسلام مولانا غلام حسین عدیل (مانچسٹر)

ادارہ کا مقالہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

خط و کتابت کیلئے

Ahlul Bayt Assembly of UK ®

In Association with

Islamic Center of England

140 Maida Vale, London, W9 1QB, UK

Web: www.ic-el.com

Email: saqalainurdu@live.co.uk

فہرست

مضامین	مقالہ نگار	صفحہ
سخن مدیر	جعفر علی نجم	3
مسئلہ فلسطین کی تاریخ، اہمیت اور راہ حل کے بارے میں رہبر معظم کے بیانات	حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیّد علی خامنہ ای مدظلہ	5
مناجاتِ حضرت امام علیؑ، مسجد کوفہ میں	حجۃ الاسلام والمسلمین ڈاکٹر محمد علی شمالی	13
شیعہ اسلامی عقائد	علامہ سیّد محمد حسین طباطبائیؒ	24
قیام حسینی کے اہداف ومقاصد	حجۃ الاسلام مولانا غلام حسین عدیل	46
کربلا میں جوانوں کا عزم	حجۃ الاسلام مولانا سیّد شمشاد حسین رضوی	54
کربلا کی خواتین	حجۃ الاسلام مولانا سیّد فدا حسین بخاری	65
ولی عہدی امام رضا علیہ السلام کا مسئلہ	استاد شہید آیۃ اللہ مرتضیٰ مطہریؒ	81
خصائص علوم اہل بیتؑ	آیت اللہ محمد محمدی ری شہری	98
شرحِ چہل حدیث	آیت اللہ العظمیٰ امام خمینیؒ	111

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخن مدیر

جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدہ دشوار
(علامہ اقبالؒ)

الحمدللہ! سہ ماہی ثقلین کا ایک اور شمارہ بروقت آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ماہ ذی الحجہ اور اسی طرح ماہ محرم الحرام کی آمد ہے، لہٰذا مصروفیات کے بڑھ جانے کی وجہ سے اس شمارے کو جلد از جلد تیار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

قارئین کرام! جون اور جولائی کے مہینوں میں اسرائیلی حکومت کی جانب سے جس طرح تمام فلسطینی مسلمانوں اور خاص طور پر غزہ کے بے گناہوں کا قتل عام کر کے ان کی نسل کشی کی گئی اور ان کے گھروں، ہسپتالوں، مساجد اور اسکولوں کو جان بوجھ کر نشانہ بنا کر جس بربریت کا مظاہرہ ہوا ہے، اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

بے شک بظاہر فلسطینیوں کا نا قابل تلافی نقصان ہوا ہے، لیکن دشمنان اسلام کامیاب نہیں ہو سکے اور نہ کبھی ہوں گے۔ بہر حال یہ تمام مسلمان ممالک کے غلام راہنماؤں کیلئے لمحہ فکریہ ہے جو اقتدار کے ایوانوں میں حکومت کے نشے میں اس طرح دھت ہیں کہ آزاد میڈیا سے ہولناک مناظر دیکھنے کے باوجود بھی ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ فلسطینیوں اور خاص طور پر غزہ کے مسلمانوں کی مظلومیت کی آواز پوری دنیا تک پہنچ چکی ہے، لیکن اسلامی ممالک کے سربراہ خواب غفلت کا شکار ہیں۔

پروردگار تمام مسلمانوں اور خاص طور پر غزہ والوں کی حفاظت فرمائے اور ظالمین اور متجاوزین کو نیست ونابود فرمائے۔آمین!

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ ہمیشہ کی طرح اب بھی غزہ کے بے گناہوں کو اور اسی کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کو درپیش تمام مسائل کے بارے میں دُعا فرمائیں۔ اللہ سبحانہ وتعالی تمام مقامات مقدسہ کی حفاظت فرمائے۔

آخر میں ہم اپنے تمام قارئین کرام کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جو رسالہ ''صدائے ثقلین'' کے بارے میں حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں۔

اسی طرح ہم جناب مولانا سیّد ریاض حسین صفوی صاحب کے احسان مند ہیں کہ جنہوں نے محنت اور نہایت ہی جانفشانی سے سہ ماہی صدائے ثقلین کی تدوین وطباعت میں کمک فرمائی ہے۔

ہمیں قارئین محترم اور خاص طور پر علمائے کرام کے مفید اور قیمتی مشوروں نیز آراء وتجاویز کا ہمیشہ کی طرح انتظار رہے گا۔شکریہ۔

والسلام

جعفر علی نجم

(8/اگست 2014ء)

*****

مسئلہ فلسطین کی تاریخ، اہمیت اور راہِ حل کے بارے میں

رہبر معظم حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیّد علی خامنہ ای مدظلہ العالی

کے بیانات اور پیغامات کے اہم اقتباسات[1]

فلسطین پر قبضے کی تاریخ

اصل واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں یہودیوں کا ایک بااثر گروہ یہودیوں کیلئے ایک مستقل ملک کی داغ بیل اور بنیاد ڈالنے کی فکر میں تھا۔ ان کی اس فکر سے برطانیہ نے اپنی مشکل حل کرنے کیلئے استفادہ کیا۔ البتہ یہودی پہلے یوگنڈا جانے اور اس کو اپنا ملک بنانے کی فکر میں تھے۔ کچھ عرصہ لیبیا کے شہر طرابلس جانے کی فکر میں رہے۔ طرابلس اس دور میں اٹلی کے قبضہ میں تھا۔ اٹلی کی حکومت سے گفتگو کی لیکن اٹلی والوں نے یہودیوں کو منفی جواب دیا۔ آخرکار یہودی برطانیہ والوں کے ساتھ مل گئے۔ اس دور میں مشرق وسطی میں برطانیہ کے اہم استعماری مقاصد تھے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے یہودی اس علاقہ میں آئیں اور ابتداء میں ایک اقلیت کے عنوان سے وارد ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی تعداد میں اضافہ کریں اور مشرق وسطی میں فلسطین کے حساس علاقہ پر اپنا قبضہ جما کر حکومت قائم کرلیں اور برطانیہ کے اتحاد کا حصہ بن جائیں اور اس علاقہ میں عالم اسلام خصوصاً عرب ممالک کو متحد نہ ہونے دیں۔ وہ دشمن جس کی باہر سے اس قدر حمایت کی جاتی ہے، وہ مختلف طریقوں اور جاسوسی ہتھکنڈوں کے ذریعہ اختلاف پیدا کرسکتا ہے اور آخر اس نے یہی کام کیا۔ استعمار کا طریقہ ہی یہ ہے کہ ایک ملک کے قریب ہوجاتا ہے، دوسرے پر حملہ کرتا ہے، ایک کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے دوسرے کے ساتھ نرمی کرتا ہے۔ اسرائیل کو پہلے برطانیہ اور بعض دوسرے مغربی ممالک کی مدد حاصل رہی۔ پھر اسرائیل آہستہ آہستہ برطانیہ سے الگ

---

[1] بشکریہ از: www.leader.ir۔

ہوگیا اور امریکہ کے ساتھ مل گیا۔ امریکہ نے بھی آج تک اسرائیل کو اپنے پروں کے سائے میں رکھا ہوا ہے۔ یہودیوں نے اس طرح اپنے ملک کو وجود بخشا کہ دوسری جگہوں سے آکر فلسطینیوں کے ملک پر قبضہ کرلیا۔ انہوں نے اس طرح قبضہ کیا کہ پہلے جنگ نہیں کی بلکہ مکر وفریب اور حیلہ کا راستہ اختیار کیا۔ بڑے بڑے فلسطینیوں کی بڑی بڑی اور سرسبز وشاداب زرعی زمینوں کو دگنی قیمت دیکر خریدا جن پر مسلمان کسان کام کرتے تھے۔ ان زمینوں کے مالک یورپ اور امریکہ میں رہتے تھے۔ انہوں نے بھی خدا خدا کر کے زمینوں کو یہودیوں کے حوالے کر دیا۔ زمینوں کی فروخت میں بڑے بڑے دلال شامل تھے جن میں سیّد ضیاء بھی تھا جس کے بارے میں معروف ہے کہ وہ رضا خان کے ساتھ 1920ء کے کودتا میں شریک تھا۔ یہاں سے فلسطین جاتا اور وہاں دلالی کرتا تھا۔ فلسطینی مسلمانوں سے یہودیوں کیلئے زمینیں خریدتا تھا۔ انہوں نے زمینیں خرید لیں اور جب زمینیں ان کی ملکیت بن گئیں تو انہوں نے پھر بڑی بے دردی، بے رحمی اور سنگدلی کے ساتھ کسانوں سے وہ زمینیں خالی کرانا شروع کر دیں۔ بعض جگہ فلسطینیوں کو مارتے تھے، قتل کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ مکر وفریب اور جھوٹ کے ذریعہ عالمی رائے عامہ کو اپنی طرف مبذول کرتے تھے۔

یہودیوں کے فلسطین پر قبضہ کے تین مرحلے ہیں:

پہلا مرحلہ عربوں کے ساتھ قساوت اور سنگدلی پر مبنی ہے۔ زمینوں کے اصلی مالکوں کے ساتھ ان کی رویہ بہت سخت اور شدید تھا۔ ان کے ساتھ کبھی بھی رحم کو روا نہیں رکھتے تھے۔

دوسرا مرحلہ عالمی رائے عامہ کے ساتھ جھوٹ اور مکر وفریب پر مبنی ہے۔ عالمی رائے عامہ کو فریب دینا ان کی عجیب وغریب باتوں میں شامل ہے۔ انہوں نے صہیونی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ فلسطین آنے سے قبل وبعد اس قدر جھوٹ بولا کہ بہت سے لوگوں نے ان کے جھوٹ پر یقین کرلیا۔ یہاں تک کہ فرانس کے رائٹر وسماجی فلسفی ''جان پل سیٹر'' کو بھی انہوں نے فریب دے دیا۔ اسی جان پل سیٹر نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا میں نے 30 سال پہلے مطالعہ کیا تھا۔ اس کتاب کا عنوان ''بغیر سرزمین کے لوگ اور بغیر لوگوں کے سرزمین'' تھا۔ یعنی یہودی وہ لوگ ہیں جن کے پاس سرزمین نہیں تھی وہ فلسطین آئے جہاں

سرزمین تھی لیکن لوگ نہیں تھے۔ کیا واقعی فلسطین میں لوگ نہیں تھے؟ ایک قوم وہاں آباد تھی۔ کام کاج میں مشغول تھی۔ بہت سے شواہد موجود ہیں۔ ایک غیر ملکی رائٹر لکھتا ہے کہ فلسطین کی تمام سرزمین پر زراعت ہوتی تھی یہ سرزمین تا حد نظر سرسبز و شاداب تھی۔ بغیر لوگوں کے سرزمین کا مطلب کیا؟! دنیا میں یہودیوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ فلسطین ایک بنجر، ویران اور بے آباد جگہ تھی، ہم نے آکر اس کو آباد کیا! رائے عامہ کو گمراہ کرنے کیلئے اتنا بڑا جھوٹ!

وہ ہمیشہ اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اب بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ امریکی جرائد جیسے ''ٹائمز'' اور ''نیوز ویک'' کا کبھی مطالعہ کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اگر ایک یہودی خاندان کسی معمولی حادثہ کا شکار ہو جائے تو اس کا بڑا فوٹو، ہلاک ہونے والے کی عمر، اس کے بچوں کی مظلومیت کو بہت بڑا بنا کر پیش کرتے ہیں، لیکن یہی جرائد مقبوضہ فلسطین میں اسرائیل کی طرف سے فلسطینی جوانوں، عورتوں، بچوں پر ہونے والے سینکڑوں اور ہزاروں مظالم، قساوت اور سنگدلی کے واقعات کی طرف معمولی سا اشارہ بھی نہیں کرتے ہیں!۔

تیسرا مرحلہ سازش اور کھوکھلے مذاکرات پر مبنی ہے اور ان کے قول کے مطابق ''لابنگ'' ہے۔ یعنی اس حکومت کے ساتھ، اس شخصیت کے ساتھ، اس سیاست دان کے ساتھ، اس روشن خیال کے ساتھ، اس رائٹر کے ساتھ، اس شاعر کے ساتھ بیٹھو گفتگو کرو! ان کے ملک کا کام اب تک مکر و فریب کے ذریعہ ان تین مرحلوں پر چل رہا ہے۔

اس دور میں بیرونی طاقتیں بھی ان کے ساتھ تھیں جن میں سرفہرست برطانیہ تھا۔ اقوام متحدہ اور اس سے پہلے اقوام متحدہ جو پہلی جنگ عظیم کے بعد صلح کے معاملات کیلئے تشکیل دیا گیا تھا بھی ہمیشہ اسرائیل کی حمایت کرتا رہا اور اسی سال 1948ء میں اقوام متحدہ نے ایک قرارداد منظور کی جس میں فلسطین کو بغیر کسی دلیل اور علت کے تقسیم کر دیا۔ اس قرارداد میں 57 فیصد اراضی کو یہودیوں کی ملکیت قرار دے دیا جبکہ اس سے قبل صرف 5 فیصد فلسطین کی اراضی یہودیوں سے متعلق تھی۔ انہوں نے حکومت تشکیل دی اور اس کے بعد مختلف مسائل رونما ہوئے جن میں فلسطینی دیہاتوں پر حملہ، شہروں پر حملہ، فلسطینیوں کے گھروں

اور بے گناہ لوگوں پر حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ البتہ عرب حکومتوں نے بھی اس سلسلے میں کافی کوتاہیاں کی ہیں۔ کئی جنگیں ہوئیں اور 1967ء کی جنگ میں اسرائیل نے امریکہ اور بعض مغربی ممالک کی مدد سے مصر، اردن اور شام کی کچھ سرزمینوں پر بھی قبضہ کرلیا۔ 1973ء کی جنگ میں بھی اسرائیلیوں نے مغربی طاقتوں کی مدد سے جنگ کا نتیجہ اپنے حق میں کرلیا اور عربوں کی مزید سرزمین پر اپنا قبضہ جمالیا۔[1]

مسئلہ فلسطین کی اہمیت

البتہ آج بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ مسئلہ فلسطین پر کیوں بحث کرتے ہیں، یہ مسئلہ ختم ہوگیا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ مسئلہ فلسطین کسی صورت میں ختم نہیں ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ یہ تصور کریں کہ فلسطین کے اصلی مالک یعنی فلسطینی ہمیشہ اپنی اولاد کے ہمراہ اپنی سرزمین سے باہر رہیں گے یا جو فلسطینی مقبوضہ سرزمین میں ہیں وہ ہمیشہ دبی ہوئی اقلیت کی صورت میں زندگی بسر کریں گے اور غیر ملکی غاصب وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ وہ ممالک جو سو سال تک دوسرے ملک کے تصرف میں رہے ہیں انہیں دوبارہ آزادی مل گئی۔ یہی قزاقستان، جارجیا اور مرکزی ایشیائی ممالک جنہیں آپ دیکھ رہے ہیں، ان میں بعض سویت یونین اور بعض سویت یونین سے پہلے روس کے قبضے میں تھے، جب سویت یونین کا وجود ہی نہیں تھا، لیکن ان کو آزادی مل گئی اور وہ اپنے عوام کو مل گئے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ فلسطین فلسطینیوں کو نہ ملے۔ یہ کام ضرور ہوگا اور ان شاء اللہ ضرور ہو کر رہے گا۔ فلسطین فلسطینی عوام کو مل کر رہے گا، لہٰذا مسئلہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس قسم کی فکر کا تصور غلط ہے۔

آج صہیونیوں اور ان کے حامیوں جن میں امریکہ ان کا سب سے بڑا اور اہم حامی ہے، کا مکر و فریب یہ ہے کہ وہ صلح کے خوبصورت اور حسین نام کا استعمال کرتے ہیں کہ صلح کیجئے۔ یہ کیسی باتیں ہیں؟ جی ہاں! صلح ایک اچھی چیز ہے، لیکن صلح کہاں اور کس سے؟! کوئی شخص آپ کے گھر میں داخل ہوجائے، طاقت کے زور پر آپ کا دروازہ توڑ دے اور آپ کو مارے پیٹے، آپ کے بال بچوں کی توہین کرے اور آپ کے گھر کے تین کمروں میں سے ڈھائی کمروں پر وہ اپنا قبضہ کر کے بیٹھ جائے اور پھر یہ

---

[1] تہران میں نماز جمعہ کے خطبوں سے خطاب۔ (31 دسمبر 1999ء)۔

کہے کہ کیوں ادھر ادھر اس کی شکایت کرتے ہو اور مسلسل لڑائی جھگڑا کرتے ہو، آؤ ہم صلح کرلیں۔ کیا یہ صلح ہوگی؟ یہ صلح ہے کہ آپ کو آپ کے گھر سے باہر نکال دیا جائے اور اگر آپ گھر پر قبضہ کرنے والے کے خلاف قیام کریں تو اس وقت دشمن کے حامی آئیں اور صلح کرائیں جبکہ غاصب دشمن آپ کے گھر میں بیٹھا ہوا ہے اور اس نے پہلے بھی آپ کے خلاف ہر ظلم کا ارتکاب کیا ہے اور اب بھی اگر اس کو موقع ملے کوئی کمی نہیں چھوڑے گا۔ آج بھی اسرائیلی حکومت تقریباً روزانہ جنوبی لبنان پر حملہ کرتی ہے، مجاہدوں پر حملہ نہیں، بلکہ جنوبی لبنان کے دیہاتوں پر، جنوبی لبنان کے مدرسوں پر۔ ابھی کچھ دن قبل اسرائیل نے جنوبی لبنان کے ایک اسکول پر حملہ کر کے کچھ بچوں کو قتل کر دیا ہے۔ بچوں نے تو کوئی حملہ نہیں کیا تھا۔ بچوں نے تو ہاتھوں میں اسلحہ نہیں لے رکھا تھا۔ اسرائیل کی اصلیت میں حملے اور تشدد کا عنصر ہے۔ جب صہیونیوں نے لبنان پر حملہ کیا تو ڈیرہ یاسین اور باقی جگہوں کے لوگوں نے تو ان کے ساتھ کچھ نہیں کیا تھا، لیکن صہیونیوں نے ان کا بھی قتل عام کیا۔ البتہ عربوں کے کچھ باغیرت جوان ان کے ساتھ اس بات پر لڑ رہے تھے اور یہی کہتے تھے کہ کیوں تم ہمارے گھر میں داخل ہوئے ہو اور لوگوں کا قتل کر رہے ہو۔ وہ لوگ جو صہیونیوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنتے تھے، وہ دیہاتی لوگ تھے جنھیں اسرائیل قتل عام کر کے ان کے گھروں سے نکال رہا تھا۔ دیہاتیوں نے تو کوئی کام نہیں کیا تھا، لہٰذا معلوم ہوا کہ اسرائیلی حکومت کی اصلیت اور حقیقت میں حملہ، خونخواری اور تشدد موجود ہے۔

اسرائیلی حکومت کی بنیاد اور داغ بیل تشدد، دھونس اور طاقت کے زور پر ڈالی گئی ہے اور اسی بنیاد پر وہ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے بغیر اس کا دوام ممکن نہیں تھا اور آئندہ بھی ممکن نہیں ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس حکومت کے ساتھ صلح کریں؟! کیسی صلح؟! ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اگر صیہونی اپنے حق پر قناعت کریں۔ یعنی وہ گھر جو فلسطین کے نام سے ہے وہ فلسطینی عوام کے حوالے کر دیں اور اپنے کام میں مشغول ہو جائیں یا فلسطینی حکومت سے اجازت لیں اور کہیں کہ ہم میں سے بعض کو یا سب کو یہاں رہنے کی اجازت دیدیں تو کسی کو ان کے ساتھ جنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جنگ یہ ہے کہ انہوں نے طاقت کے زور پر دوسروں کے گھر پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے، انہوں نے گھر والوں کو گھر سے باہر نکال دیا ہے اور اب بھی ان

پر ظلم وتشدد کو روا رکھے ہوئے ہیں۔ یہ علاقے کے دیگر ممالک پر بھی ظلم کرتے ہیں اور سب کیلئے خطرہ بنے ہوئے ہیں، لہٰذا وہ صلح کو بھی بعد والے حملے کا مقدمہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی صلح برقرار ہوجائے تا کہ یہ صلح ان کے آئندہ حملے کیلئے مقدمہ قرار پا سکے۔[1]

مسئلہ فلسطین کا منطقی اور پائیدار حل

مسئلہ فلسطین کا راہ حل، جھوٹے اور بے بنیاد طریقوں پر نہیں ہوسکتا، بلکہ مسئلہ فلسطین کا راہ حل صرف یہ ہے کہ فلسطین کے حقیقی مالک (نہ کہ باہر سے آنے والے غاصب اور قابض مہاجرین) جو فلسطین کے اندر موجود ہیں اور جو فلسطین کے باہر ہیں وہ اپنے ملک کا حکومتی نظام تشکیل دیں۔ اگر دنیا میں ڈیموکریسی کا دعوی کرنے والوں کی یہ بات درست ہے کہ ہر قوم کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق ہے تو فلسطینی قوم بھی ایک قوم ہے اور اس کو بھی فیصلہ کرنا چاہیے۔ مقبوضہ فلسطین پر آج جو غاصب حکومت قائم ہے، اس کا فلسطین کی سرزمین پر کوئی حق نہیں ہے۔ وہ ایک جعلی، جھوٹ پر مبنی اور ظالم طاقتوں کی بنائی ہوئی حکومت ہے، لہٰذا فلسطینی عوام سے غاصب حکومت کو سرکاری طور پر تسلیم کرنے کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر عالم اسلام میں کوئی اس غلطی کا ارتکاب کرے گا اور اس ظالم حکومت کو سرکاری طور پر تسلیم کرے گا تو گویا وہ اپنے لئے ذلت ورسوائی کا سامان فراہم کرے گا اور اس کا اقدام بیہودہ اور بے فائدہ بھی ہوگا، کیونکہ یہ حکومت دائمی نہیں ہے۔ صہیونیوں نے یہ تصور کرلیا ہے کہ وہ فلسطین پر قابض ہوگئے ہیں اور فلسطین ہمیشہ ان کی ملکیت بن گیا ہے، نہیں، ایسا نہیں ہے۔ فلسطین کا فیصلہ یہ ہے کہ حتمی طور پر ایک دن فلسطینی ملک وجود میں آئے گا۔ فلسطینی عوام نے اس سلسلے میں قیام کیا ہے۔ مسلمان حکومتوں اور عوام کا فرض ہے کہ وہ اس فاصلے کو زیادہ سے زیادہ کم کریں اور ایسا کام کریں کہ فلسطینی عوام کو یہ دن دیکھنا جلد از جلد نصیب ہوجائے۔[2]

---

[1] تہران میں نماز جمعہ کے خطبوں سے خطاب۔ (31 دسمبر 1999ء)۔

[2] مزار امام خمینیؒ میں زائرین کے اجتماع سے خطاب۔ (4 جون 2002ء)۔

فلسطینی عوام کی استقامت قابل تعریف ہے

اسلامی حکومتوں کو غزہ کا محاصرہ توڑنا چاہیے اور اس سلسلے میں مصری عوام اور حکومت کی اہم ذمہ داری ہے اور تمام مسلمان قومیں اس فریضہ کو انجام دینے میں مصری حکومت اور عوام کی مدد کریں۔ جب تک فلسطین اور غزہ کے عوام آگ اور خون میں غلطاں ہیں اس وقت تک علاقائی ممالک کے امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ مذاکرات کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور غزہ میں موجودہ دردناک شرائط امریکی صدر بش کے علاقے کے دورے کا نتیجہ ہیں۔ عرب حکومتوں کو ہوشیار رہنا چاہیے تاکہ ان سے یا فلسطین کے دیگر عناصر سے غزہ کے عوام کے خلاف استفادہ نہ کیا جائے اور اگر ایسا ہوا تو یہ بدنما داغ ان کی پیشانی پر ہمیشہ قائم رہے گا۔ عظیم اقتصادی دباؤ، اسرائیلی فوجی حملے اور قتل و غارت کے باوجود فلسطین اور غزہ کے عوام کی استقامت و پائیداری قابل تعریف ہے اور فلسطینی عوام کو دشمنوں کی سازشوں کے بارے میں بھی ہوشیار رہنا چاہیے جو فلسطینی عوام اور ان کی منتخب حکومت کے درمیان اختلاف ڈالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔[1]

اسلامی دنیا تمام اختلافات بھلا کر غزہ کے عوام کی مدد کرے

اسلامی دنیا کو اپنے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، پوری توانائی سے غزہ کے مظلوم عوام کی ضرورتوں کی تکمیل کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ دنیا کے تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ غزہ کے عوام کا بھرپور ساتھ دیں، صیہونی حکومت کے بے شرمانہ جرائم کی مذمت کریں اور اس ظالم حکومت اور اس کے حامیوں بالخصوص امریکا اور برطانیہ سے اپنی نفرت اور بے زاری کا اعلان کریں۔

افسوس کہ آج اسلامی تعلیمات کے برخلاف سیاسی محرکات اور اقتدار پسندی نے امت اسلامیہ کو اختلاف و تفرقے سے دوچار کر دیا ہے۔ اگر اقتدار پسندی، وابستگی اور بدعنوانی کے نتیجے میں اسلامی دنیا اختلاف و تفرقے میں نہ پڑے تو دنیا کی کوئی بھی سامراجی طاقت اسلامی ملکوں کے خلاف جارحیت اور اسلامی حکومتوں سے بہتہ وصول کرنے کا مطالبہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔

---

[1] ایرانی فضائیہ سے خطاب۔ (8 فروری 2008ء)۔

مغربی دنیا کے میڈیا سنسر کی وجہ سے مغربی ممالک کے عوام غزہ کے حوادث کی گہرائیوں سے واقف نہیں ہو سکے ہیں لیکن یہ جرائم اتنے بہیمانہ اور اندوہناک ہیں کہ ان کے صرف ایک گوشے کے مغربی میڈیا میں نشر ہو جانے سے غیر مسلم اقوام بھی لرز گئیں اور سڑکوں پر نکل آئیں۔

اسلامی حکومتوں کیلئے ہمارا واضح پیغام یہ ہے کہ آیئے مظلوموں کی مدد کیلئے اٹھ کھڑے ہوں اور ثابت کر دیں کہ عالم اسلام ظلم وستم پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ اس ہدف کی تکمیل کیلئے تمام مسلم حکومتوں کو چاہئے کہ سیاسی وغیر سیاسی اختلافات کو بھلا کر اور مل کر ان مظلوموں کی حمایت کیلئے آگے بڑھیں جو خونخوار صیہونی بھیڑیوں کے چنگل میں پھنسے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ آیئے، مل کے اور متحد ہو کے، اپنے دینی اور انسانی فریضے پر عمل کریں، غزہ تک امداد رسانی میں حائل رکاوٹوں کو دور کریں اور غزہ کے عوام کی مدد کریں۔ جرائم پیشہ صیہونی اور ان کے حامی غزہ میں حیرت انگیز قتل عام اور نفرت انگیز طفل کشی کے بہانے تراش رہے ہیں جو ان کی خباثت و بے حیائی کی انتہا ہے۔ اسلامی حکومتوں اور اقوام کا فریضہ ہے کہ تل ابیب کے جلاد صفت حکام کے حامیوں اور اتحادیوں سے بھی نفرت اور بیزاری کا اعلان کریں اور حتی المقدور ان کا اقتصادی اور سیاسی بائیکاٹ کریں۔[1]

*****

[1] عید الفطر کی مناسبت سے اسلامی ملکوں کے سفیروں اور عوام کے مختلف طبقات سے خطاب۔ (29 جولائی، 2014ء)۔

مناجاتِ امام علیؑ، مسجد کوفہ میں

حجۃ الاسلام والمسلمین ڈاکٹر محمد علی شمالی

یہ مناجات (سرگوشی میں دُعا) خود کلامی سے مماثلت رکھتی ہے جو حضرت امام علی علیہ السلام نے خدا سے مخاطب ہوتے ہوئے عرض کی ہے۔ امام علیہ السلام اس میں اس امر پر زور دیتے ہیں کہ خدا ہی ہے جو رحمت نازل کرنے والا ہے، خالق ہے، لامحدود ہے اور عظیم ہے، جبکہ ہم مخلوق ہیں، محدود ہیں اور ادنیٰ ہیں۔ یہ دُعا بہت رقت انگیز ہے۔

مناجات کے ماٰخذ

یہ دُعا درج ذیل کتب سے روایت کی گئی ہے:

۱۔ البلد الامین، ابراہیم بن علی العاملی الکفعمیؒ (۸۴۰۔۹۰۵ھ)، ص ۳۱۹۔۳۲۰۔

۲۔ بحار الانوار، علامہ مجلسیؒ (۱۰۳۷۔۱۱۱۰ھ)، ج ۹۱، ص ۱۰۹۔۱۱۱ و ج ۹۷، ص ۴۱۹۔۴۲۰۔

مناجات کا مفہوم

''مناجات'' کا لفظ ''ن، ج، و'' سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے ''کسی سے قریب سے کلام کرنا''۔ مناجات ایک طرح کی سرگوشی ہے، مگر یک طرفہ نہیں۔ قواعد کی رو سے یہ دو طرفہ عمل ہے۔ یعنی یہ لفظ تب استعمال ہوتا ہے جب ایک شخص خدا سے بہت رازدارانہ کلام کرتا ہے اور رب کردگار اپنے بندے کی بات سنتا ہے اور شاید جواب بھی دیتا ہے۔ راویت کے مطابق اللہ ان سے سرگوشی کرتا ہے جو اس سے محبت کرتے ہیں۔ یعنی پروردگار ان کے دلوں اور دماغوں میں خیال ڈالتا ہے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام

رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ فرماتے ہیں:

اِنَّ مُوْسٰی بْنَ عِمْرَانَ سَئَلَ رَبَّهٗ وَ رَفَعَ یَدَیْهِ فَقَالَ: یَا رَبِّ! اَبَعِیْدٌ اَنْتَ فَاُنَادِیَكَ؟ اَمْ قَرِیْبٌ فَاُنَاجِیَكَ؟ فَاَوْحَی اللّٰهُ تَعَالٰی اِلَیْهِ: یَا مُوْسٰی! اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَكَرَنِیْ۔

ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اٹھا کر بارگاہ رب میں عرض کی: ''اے میرے ربّ! تو دور ہے کہ میں تجھے پکاروں یا تو نزدیک ہے کہ میں سرگوشی کروں؟'' آواز قدرت آئی: ''اے موسیٰ! میں اس شخص کے بالکل ساتھ ہوں جو مجھے یاد کرتا ہے''۔[1]

مناجات کا پہلا حصہ

یہ مناجات تین اہم حصوں پر مشتمل ہے:

پہلے حصے میں حضرت امام علی علیہ السلام روز محشر کی پریشانیوں کو بیان کرتے ہیں۔ ہر کسی کیلئے اس روز بہت سنجیدہ مسائل ہیں اور امام علی علیہ السلام اس دن اپنی حفاظت کی ضرورت کا اعلان کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس دن کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں۔ امام علی علیہ السلام اس بارے میں قرآن مجید کی بعض آیات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ آپؑ نے اس مناجات کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْاَمَانَ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ۔

اے اللہ! میں تجھ سے اس دن کی پناہ مانگتا ہوں جس دن نہ مال کسی کام آئے گا اور نہ اولاد رہے گی، سوائے اس کے جو قلب سلیم کے ساتھ آئے گا۔

اس جملے کے مطابق، روز محشر نہ مال کام آئے گا اور نہ ہی اولاد جنہیں دنیا میں ہم اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے تھے۔ اس دن صرف قلب سلیم یعنی پاک دل کام آئے گا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بھی یہی فکر تھی جیسا کہ قرآن مجید نے اس سے نقل کیا:

---

[1] بحار الانوار، ج ۹۰، ص ۳۲۲۔

﴿وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ۝ يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۝ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝﴾

اس دن جب تو سب کو اٹھائے گا، مجھے شرمندہ نہ کرنا۔ اس دن نہ مال اور نہ ہی اولاد کام آئے گی، سوائے اس کے جو خدا کے سامنے قلب سلیم کے ساتھ آئے گا۔[1]

بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام قلب سلیم رکھتے تھے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

﴿وَإِنَّ مِن شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ۝ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝﴾

بے شک ابراہیم علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے پیروکار تھے۔ جب وہ اللہ کی بارگاہ میں قلب سلیم کے ساتھ حاضر ہوئے۔[2]

حضرت امام علی علیہ السلام اس مناجات کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَ اَسْئَلُكَ الْاَمَانَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ: يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا۔

اور میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں اُس دن سے جب ظالم اپنے ہاتھ چباتا ہوا یہ کہتا ہوا آئے گا: کاش! میں پیغمبر کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا۔

وَ اَسْئَلُكَ الْاَمَانَ يَوْمَ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ الْاَقْدَامِ۔

اور میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں اس دن سے جب مجرم (گنہگار) اپنے حلیے سے پہچانیں جائیں گے اور انہیں پیشانی اور پیروں سے جکڑ لیا جائے گا۔

اس دن ہر ایک کا چہرہ یہ بتائے گا کہ وہ اچھا ہے یا برا۔ اس کے نامۂ اعمال کو پڑھنے یا اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہاں پر اس کی نیتوں سمیت ہر چیز عیاں ہوگی۔ نامۂ اعمال ایک رسمی کارروائی ہوگی، وگرنہ لوگوں کا چہرہ ان کی منزل بتا رہا ہوگا۔ قرآن مجید کے مطابق مومنین اپنے نور کی وجہ

---

[1] سورۂ شعراء، آیت ۸۷۔۸۹۔

[2] سورۂ صافات، آیت ۸۳۔۸۴۔

سے پہچانے جائیں گے۔ ارشاد رب العزت ہے:

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

اس دن جب پروردگار اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مایوس نہیں کرے گا اور مومنین ان کے ساتھ ہوں گے۔ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں بائیں چل رہا ہوگا۔ وہ کہہ رہے ہوں گے: اے ہمارے ربّ! ہمارے نور کو کامل کر دے اور ہمیں بخش دے، بیشک تو ہر شے پر قادر ہے۔[1]

مومنین کا نور ان کے دائیں طرف غالباً اس لئے ہوگا کیونکہ ان کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ یہ چیز قابل توجہ ہے کہ وہ گزارش کریں گے کہ ان کے نور کو کامل کر دیا جائے، کیونکہ یہ ان کے کچھ گناہوں کی وجہ سے ہوگا جس کی وجہ سے ان کے نور میں کچھ کمی ہوگی۔ اس بنا پر وہ اللہ سے مغفرت کے طلبگار رہوں گے۔ یہ آیہ مجیدہ مومنین کیلئے خوشخبری ہے، کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روز محشر مومنین کو مغفرت طلب کرنے کا موقع ملے گا، حالانکہ موت کے بعد عموماً نیک کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

اس دن تم مومن مرد اور مومنہ عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور داہنی طرف چل رہا ہے اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ آج تمہاری بشارت کا سامان وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور تم ہمیشہ ان ہی میں رہنے والے ہو اور

---

[1] سورۂ تحریم، آیت ۸۔

یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔[1]

اس دن منافقین کے ساتھ کوئی نور نہ ہوگا اور وہ مومنین سے نور کی التجا کریں گے۔ ارشاد ہے:

﴿يَوْمَ يَقُولُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾

اس دن منافق مرد اور منافق عورتیں صاحبان ایمان سے کہیں گے کہ ذرا ہماری طرف بھی نظر مرحمت کرو کہ ہم تمہارے نور سے استفادہ کریں تو ان سے کہا جائے گا کہ پیچھے ہو جاؤ اور اپنے شیاطین سے نور کی التماس کرو اس کے بعد ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب ہوگا۔[2]

ان دونوں کے درمیان فرق بہت عبرت آموز ہے۔ مومنین جن کے پاس نور ہے وہ خدا سے اور نور میں اضافے کی درخواست کریں گے اور منافقین جن کے پاس کوئی نور نہیں وہ خدا کی بجائے مومنین سے نور مانگیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے اس حالت میں بھی، وہ یہ بھول رہے ہوں گے کہ اگر انہیں کچھ چاہیے تو اپنے رب سے مانگیں۔

قرآن مجید کے مطابق روز محشر چہروں کے حوالے سے لوگوں کی دو قسمیں ہوں گی۔ ارشاد ہے:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝﴾

اس دن کچھ چہرے چمکتے ہوئے، ہنستے ہوئے اور خوش و خرم ہوں اور کچھ چہرے گرد سے اٹے ہوئے ہوں گے اور ان پر مردنی چھائی ہوگی۔ یہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا۔[3]

---

[1] سورۂ حدید، آیت ۱۲۔

[2] سورۂ حدید، آیت ۱۳۔

[3] سورۂ عبس، آیت ۳۸۔ ۴۲۔

ایک اور آیت میں ان چہروں کو اس طرح بیان کیا ہے:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۝ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝﴾

اس دن بعض چہرے شاداب ہوں گے، اپنے پروردگار کی نعمتوں پر نظر رکھے ہوئے ہوں گے۔ اور بعض چہرے افسردہ ہوں گے جنہیں یہ خیال ہوگا کہ کب کمر توڑ مصیبت وارد ہو جائے۔[1]

بہر صورت بروز قیامت ہر شخص کی حقیقت اس کے چہرے سے واضح ہوگی۔

آگے چل کر حضرت امام علی علیہ السلام اپنی اس مناجات میں قرآن کریم کی کچھ دیگر آیات کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ آپؑ بارگاہ ربّ میں عرض کرتے ہیں:

وَ اَسْئَلُكَ الْاَمَانَ يَوْمَ لَا يَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَ لَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا. اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ۔

اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس دن سے جب باپ اپنے بچے کی پرواہ نہیں کرے گا اور نہ بچہ باپ کی، بیشک خدا کا وعدہ سچا ہے۔

وَ اَسْئَلُكَ الْاَمَانَ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ۔

اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس دن کی جب ظالموں کا کوئی بہانہ کارگر نہ ہوگا اور ان کیلئے لعنت اور برا ٹھکانہ ہوگا۔

وَ اَسْئَلُكَ الْاَمَانَ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَّ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ۔

اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس دن کی جب کسی شخص کو دوسرے پر کوئی قدرت حاصل نہ ہوگی۔ اس دن صرف خدا کا امر چلے گا۔

---

[1] سورۂ قیامت، آیت ۲۲۔۲۵۔

وَ اَسْئَلُكَ الْاَمَانَ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ. لِكُلِّ امْرِىءٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ۔

اور میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں اس دن کی جب انسان اپنے بھائی، ماں باپ اور بیوی بچوں سے بھاگ رہا ہوگا۔ اس دن ہر ایک خود اپنی پریشانی میں غرق ہوگا۔

وَ اَسْئَلُكَ الْاَمَانَ يَوْمَ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِىْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ اَخِيْهِ وَ فَصِيْلَتِهِ الَّتِىْ تُؤْوِيْهِ وَ مَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ۔

اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس دن کی جب مجرم چاہے گا کہ کاش وہ اپنے بچوں، بیوی، بھائی، کنبے کہ جس میں وہ رہتا تھا اور تمام اہل زمین کو بطور فدیہ دے کر اس دن کے عذاب سے نجات پا جائے۔

ان جملوں کی بنیاد پر روز قیامت ایسا خوفزدہ کرنے والا دن ہوگا کہ انسان اپنے ہر چاہنے والے سے نجات چاہے گا اور اپنی نجات کیلئے حتیٰ کہ انہیں قربان کرنے کیلئے تیار ہو جائے ہوگا۔ معاملہ اتنا خراب ہوگا کہ ایک ماں فرشتوں سے گزارش کرے گی کہ میرے بچے کو لے لو مگر مجھے بچا لو۔ اسی طرح بچہ ماں باپ کیلئے یہی کہے گا۔ یہ حیران کن بات نہیں۔ اس دنیا میں ہمیں کچھ ایسے کم ایمان والے لوگ دکھائی دیتے ہیں کہ جب ان پر کوئی پریشانی آتی ہے تو کسی کی بھی پرواہ کئے بغیر صرف اپنی نجات کے طلبگار ہوتے ہیں۔ بنابریں اگلے جہان میں جب لوگ ناقابل تصور عذاب کو اپنے سامنے دیکھیں گے تو وہ یہی کچھ کریں گے جیسے کہ پہلے کہا گیا ہے۔ البتہ یہ معاملہ کفار کے ساتھ ہے اور جہاں تک مومنین کی بات ہے تو وہ پریشانی کے عالم میں کبھی اپنے ماں باپ اور بچوں کو بھلاتے نہیں ہیں۔ اسی لئے ارشاد ہے:

﴿اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾[1]

اس دن، دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، سوائے متقین کے۔[1]

---

[1] سورۂ زخرف، آیت ۶۷۔

پس متقین ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوں گے، کیونکہ ان کی دوستی شیطانی خواہشات پر مبنی نہیں ہوتی۔ اگر دوستی دنیاوی امور یا گناہ پر مبنی ہوتو قیامت کے دن وہ دشمنی میں تبدیل ہو جائے گی۔ متقین روز قیامت کے امتحان سے کامیاب نکل جائیں گے۔ مومن اس دن بھی اپنے احباب اور خاندان کے بارے میں فکرمند ہوگا۔ ابن عباسؓ پیغمبر اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

اِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ الْجَنَّةَ سَئَلَ عَنْ اَبَوَيْهِ وَزَوْجَتِهٖ وَوَلَدِهٖ. فَيُقَالُ: اِنَّهُمْ لَمْ يَبْلُغُوْا دَرَجَتَكَ وَ عَمَلَكَ. فَيَقُوْلُ: يَا رَبِّ! قَدْ عَمِلْتُ لِيْ وَلَهُمْ فَيُؤْمَرُ بِالْحاقِهِمْ بِهٖ وَقَرَاَ ابْنُ عَبَّاسٍ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔۔۔﴾[1]۔

جب مومن جنت میں داخل ہوگا تو وہ (پروردگار سے) اپنے والدین، بیوی اور بچوں کے بارے میں سوال کرے گا۔ جس پر اسے بتایا جائے گا کہ وہ درجہ اور عمل میں تیرے برابر نہیں ہیں۔ یہ سن کر وہ عرض کرے گا: پروردگار! میں نے جو بھی نیک عمل کیا وہ اپنے اور ان کیلئے کیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کو بھی اس مومن کے ساتھ ملحق کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ ابن عباسؓ نے یہ روایت سنا کر اس آیہ مجیدہ کی تلاوت کی جس میں ارشاد ہے: ''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی اتباع کی تو ہم ان کی ذریت کو بھی ان ہی سے ملا دیں گے''۔[2]

جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس مطلب کی قرآن کریم بھی تائید کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی اتباع کی تو ہم ان کی ذریت کو بھی ان ہی سے ملا دیں گے اور کسی کے عمل میں سے ذرہ برابر بھی کم

---

[1] سورۂ طور، آیت ۲۱۔

[2] معجم کبیر، طبرانی، ج ۱۰، ص ۱۳۳۔

نہیں کریں گے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا مرہون منت ہے۔[1]

پس ایک دیندار مومن نیک اعمال کرتا ہے مگر ساتھ ساتھ یہ خواہش بھی رکھتا ہے کہ اس کا اجر صرف اسے نہ ملے بلکہ اس کے خاندان، اس کے احباب بلکہ تمام جماعت کو بھی ملے۔

مناجات کا دوسرا حصہ

امام علی علیہ السلام بندے کی حالت بیان کرنے کے بعد مناجات کے دوسرے حصے میں رب کردگار کا تعارف کرواتے ہیں۔ مناجات کے اس حصے میں آپؑ پروردگار عالم کی مختلف صفات کو بیان کرتے ہوئے ان صفات کی ضد بندے کی خامیوں کا اعتراف بیان کرتے ہیں۔ امام علیہ السلام اعلان کرتے ہیں کہ صرف اور صرف خدا ہی بندوں پر رحم کرسکتا ہے اور کوئی نہیں۔ اس حصے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

مَوْلَایَ یَا مَوْلَایَ اَنْتَ الْمَوْلٰی وَ اَنَا الْعَبْدُ وَ هَلْ یَرْحَمُ الْعَبْدَ اِلَّا الْمَوْلٰی؟

میرے مولا، اے میرے مولا! تو مالک ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور سوائے مالک کے بندے پر کون رحم کرسکتا ہے؟

مَوْلَایَ یَا مَوْلَایَ اَنْتَ الْمَالِكُ وَ اَنَا الْمَمْلُوْكُ وَ هَلْ یَرْحَمُ الْمَمْلُوْكَ اِلَّا الْمَالِكُ؟

میرے مولا، اے میرے مولا! تو آقا ہے اور میں تیرا غلام ہوں اور غلام پر سوائے آقا کے کون رحم کرسکتا ہے؟

مَوْلَایَ یَا مَوْلَایَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ وَ اَنَا الذَّلِیْلُ وَ هَلْ یَرْحَمُ الذَّلِیْلَ اِلَّا الْعَزِیْزُ؟

میرے مولا، اے میرے مولا! تو صاحب عز وجلال ہے اور میں ذلیل وحقیر اور سوائے صاحب عز وجلال کے ذلیل وحقیر پر کون رحم کرسکتا ہے؟

مَوْلَایَ یَا مَوْلَایَ اَنْتَ الْخَالِقُ وَ اَنَا الْمَخْلُوْقُ وَ هَلْ یَرْحَمُ الْمَخْلُوْقَ اِلَّا الْخَالِقُ؟

میرے مولا! اے میرے مولا! تو خالق ہے اور میں مخلوق اور مخلوق پر سوائے خالق کے کون رحم کرسکتا ہے؟

---

[1] سورۂ طور، آیت ۲۱۔

مَوْلَایَ یَا مَوْلَایَ اَنْتَ الْمُعْطِیْ وَ اَنَا السَّآئِلُ وَ هَلْ یَرْحَمُ السَّآئِلَ اِلَّا الْمُعْطِیْ؟

میرے مولا، اے میرے مولا! تو عطا کرنے والا ہے اور میں سوالی اور عطا کرنے والے کے سوا سوالی پر کون رحم کر سکتا ہے؟

مناجات کے اس حصے میں امام علیہ السلام نے درج ذیل دیگر صفات کا ذکر کیا ہے:

عطا کرنے والا اور مانگنے والا۔ ہمیشہ رہنے والا اور وہ جو مر جائے گا۔ رازق اور مرزوق۔

سخی اور کنجوس۔ نجات دینے والا اور نجات مانگنے والا۔ عظیم اور ناچیز۔ ہادی اور گمراہ۔

حاکم اور محکوم۔ واضح و حجت اور حیران و پریشان۔ معاف کرنے والا اور گنہگار۔

فاتح اور مفتوح۔ پرورش کرنے والا اور پرورش پانے والا۔ اعلیٰ اور عاجز

مناجات کا تیسرا حصہ

قیامت کے دن کی پریشانیوں کے تذکرے کے بعد اور پھر یہ کہ سوائے خدا کے ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا، حضرت امام علی علیہ السلام اپنے خدا کو پکارتے ہوئے فرماتے ہیں:

مَوْلَایَ یَا مَوْلَایَ ارْحَمْنِیْ بِرَحْمَتِكَ وَ ارْضَ عَنِّیْ بِجُوْدِكَ وَ كَرَمِكَ وَ فَضْلِكَ یَا ذَا الْجُوْدِ وَ الْاِحْسَانِ وَ الطَّوْلِ وَ الاِمْتِنَانِ بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔

میرے مولا، اے میرے مولا! اپنی رحمت کے صدقے مجھ پر رحم فرما اور تجھے واسطہ اپنے جود و کرم اور فضل کا مجھ سے راضی ہو جا، اے سخاوت، نیکی، کرم اور احسان کے مالک! تجھے تیری رحمت کا واسطہ، اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے۔

واضح رہے کہ الٰہی رحمت سب سے اہم چیز ہے۔ پروردگار اپنے بندوں سے پوری زندگی رحم سے پیش آتا ہے۔ اس لئے امام علی علیہ السلام اس امید کا اظہار کرتے ہیں کہ ایسا مہربان خدا اپنی رحمت سے اس وقت محروم نہیں کرے گا جب اسے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ خدا کی رحمت ہماری تخلیق سے

پہلے شروع ہوجاتی ہے۔ وہ ہمارے والدین کے دلوں میں ہمارے لئے رحمت ڈال دیتا ہے۔ پھر اس کی رحمت ساری زندگی ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

پس اپنی رحمت وہ کنجی ہے جس سے ہر تالا کھل سکتا ہے۔ اگر کسی کو کوئی پریشانی ہو تو اسے چاہیے کہ خدا سے اس کی رحمت کی بھیک مانگے۔ یقیناً خدا ہر وقت مدد کیلئے موجود ہے۔ اگر ہم سب سے سخی ترین شخص کے سامنے جائیں مگر اس سے درخواست نہ کریں تو وہ مدد نہیں کرے گا۔ اسی طرح، خدا ان پر اپنی رحمت کی بارش کرتا ہے جو اس کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔ بیشک اس دنیا میں خدا کی رحمت ان لوگوں پر بھی ہے جو اسے نہیں پہچانتے۔ مگر قیامت میں یہ صرف ان لوگوں کیلئے ہوگی جو اس کے حقدار ہوں گے۔

*****

دین کی پناہ گاہ

پلا ہے دین خدا ظلم کی گھٹاؤں میں
عجب چراغ تھا کھیلا کیا ہواؤں میں

کبھی رسولؐ کے اخلاق سے سکون ملا
کبھی بتولؑ کی تسبیح کی صداؤں میں

بلند کر دیا شمشیرِ حیدری نے کبھی
اُٹھا کے خیبر و صفین کی فضاؤں میں

علیؑ کے بعد تپش بڑھ گئی جو باطل کی
تو آ کے دم لیا صلحِ حسنؑ کی چھاؤں میں

کبھی حسینؑ کے سجدوں نے زندگی بخشی
سکوں ملا کبھی عباسؑ کی وفاؤں میں

مگر کہیں نہ ٹھکانہ ملا بعد حسینؑ
قریب تھا کہ نکل جائے دم جفاؤں میں

یزیدیت کا تسلط تھا ہر جگہ لیکن
پناہ مل گئی سجادؑ کی دُعاؤں میں

(پیام اعظمی)

قسط:8

شیعہ اسلامی عقائد

{پیغمبر شناسی}

از: علامہ سیّد محمد حسین طباطبائیؒ

ہدف کی طرف سفر یا عمومی ہدایت

گندم کا دانہ جو مٹی کے اندر خاص شرائط کے ساتھ بویا جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ رشد و نمو کرتا ہوا انقلاب کی شاہراہ پر گامزن ہوتا ہے اور ہر لحظہ اپنی شکل اور حالت بدلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اپنا فطری راستہ کرتا ہوا مکمل پودا اور بوٹا بن جاتا ہے جس کے کئی خوشے (بالیاں) ہوتے ہیں اور اگر اس پودے کا ایک دانہ زمین پر گرے تو وہ بھی اپنا راستہ طے کرتا ہوا یہی حالت اختیار کرے گا اور اگر ایک پھل کی گٹھلی ہے تو وہ بھی زمین میں اپنی حرکت آغاز کر کے اپنے خول یا چھلکے کو پھاڑتی ہوئی سبز کونپل نکالتی ہے اور پھر منظم اور معین راستے کو طے کرتی ہوئی آخر کار ایک تنومند درخت کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کے پتے سبز اور پھل میٹھے ہوتے ہیں۔

اگر حیوان یا انسان کا نطفہ ہے تو انڈے یا ماں کے رحم کے اندر ارتقاء پیدا کر کے ایک معین راستے یا منزل کو طے کرتا ہوا جو اس حیوان یا انسان کے نطفے کیلئے مخصوص ہے، کامل انسان یا حیوان بن جاتا ہے۔

یہی معین اور منظم طریقہ، ہر قسم کی پیدائش اور فطرت کیلئے، جو اس دنیا میں موجود ہے، قائم اور جاری ہے اور اپنی فطرت میں اپنی ہی خاص قسم کے مطابق ہوگا۔ یعنی گندم کا سبز پودا اپنے دانے سے شروع ہو کر ہرگز بھیڑ یا بکری نہیں بن سکتا اور مادہ حیوان جو اپنے نر حیوان سے حاملہ ہوتی ہے ہرگز گندم کی بالی یا چنار کا درخت پیدا نہیں کر سکتی۔ بنابریں اگر اعضاء کی ترکیب میں کسی قسم کا نقص پیدا ہو جائے اور بچے کی

قدرتی ارتقائی عمل میں کوئی کمی بیشی واقع ہوجائے مثلاً ایک بھیڑ کا بچہ اندھا پیدا ہو یا گندم کے پودے پر بالیاں نہ لگیں تو ہمارے لئے اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہے گا کہ یہ سب کچھ کسی بیماری کی وجہ سے ہوگیا ہے یا بعض مخالف عناصر اور عوامل کے سبب ایسا ہوا ہے (ورنہ اس کی فطرت ایسی نہیں تھی)۔

اشیاء کی تبدیلی اور پیدائش میں دائمی نظم ونسق اور ہر قسم کی پیدائش اور فطرت میں خاص قسم کا ارتقا ایک دانشور محقق کیلئے ناقابل انکار حقیقت ہے۔اس واضح نظریئے سے دو اور نتیجے حاصل کئے جاسکتے ہیں:

۱۔ ہر قسم کی مخلوق اپنی پیدائش کے آغاز سے لے کر جو تمام مراحل طے کرتی ہے، اس میں ایک رابطہ اور تعلق واتصال موجود ہے۔مثلاً مذکورہ بالا تمام چیزیں اپنی جسمی تبدیلی اور ارتقا کے دوران مختلف مراحل سے گزرتی ہیں۔یعنی ایک مرحلے سے نکل کر اگلے مرحلے میں داخل ہوتی ہیں۔

۲) مندرجہ بالا اشیاء کے اتصال وارتباط کے پیش نظر ہر قسم کی مخلوق کا آخری مرحلہ اپنی پیدائش سے لے کر ارتقا تک، اپنی ہی خاص قسم اور مخلوق کے دائرے کے اندر رہتا ہے۔جیسا کہ اخروٹ کا بیج جو مٹی کے نیچے سبز کونپل نکالتا ہے تو اس وقت سے لے کر اس کا ارتقا ایک تنومند اخروٹ کے درخت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ایسے ہی انڈے یا ماں کے رحم میں بچہ بھی شروع ہی سے ایک مکمل حیوان یا انسان کی صورت ہے جو مختلف مراحل طے کرتا ہوا اپنی آخری شکل اور حد تک پہنچ جاتا ہے۔

قرآن مجید اپنی تعلیمات میں (جو تمام چیزوں کی پیدائش اور پرورش کو خدا سے منسوب کرتا ہے) ارتقا اور مختلف مراحل سے گزرنے اور بڑھنے کو جو ہر قسم کی مخلوق اپنی ترقی کی راہ میں اپنے سامنے رکھتی ہے، اس کو خدا کی رہبری اور ہدایت سے منسوب کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

﴿رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی﴾

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے۔[1]

اور پھر فرماتا ہے:

---

[1] سورۂ طٰہٰ، آیت ۵۰۔

﴿الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝﴾

جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا اور درست کیا اور جس نے (اس کا) اندازہ مقرر کیا پھر راہ بتائی۔[1]

اور ان آیات کے نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾

ہر چیز کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ ہمیشہ اسی کی جانب گامزن ہوتی ہے۔[2]

﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر (بے مقصد) پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ حقیقت اور فطرت (ہدف، مقصد اور غرض وغایت) پر پیدا کیا ہے، لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے۔[3]

خصوصی ہدایت

ظاہر ہے کہ انسان بھی ان کلیات سے مستثنیٰ نہیں ہے اور یہی تکوینی ہدایت (ارتقائی ہدایت) ہے جو تمام کائنات اور انسان میں بھی حکومت کرتی ہے اور جیسا کہ ہر چیز اپنی خاص اصلیت کے ساتھ کمال اور ارتقا کی طرف گامزن ہے اور مختلف مراحل میں ہدایت حاصل کرتی رہتی ہے، انسان بھی اپنی اصلی اور تکوینی ہدایت کے ساتھ کمال اور بلندی کی طرف ہدایت پاتا رہتا ہے۔ اگرچہ انسان بہت زیادہ خصائص میں دوسری تمام حیوانی اور نباتاتی کائنات کے ساتھ شریک ہے، مگر اس میں ایک خصوصی خاصیت بھی موجود ہے جو دوسری چیزوں سے اس کو جدا اور ممتاز کرتی ہے اور وہ ہے ''عقل انسانی''۔

---

[1] سورۂ اعلیٰ، آیت ۲۔۳۔

[2] سورۂ بقرہ، آیت ۱۴۷۔

[3] سورۂ دخان، آیت ۳۸۔۳۹۔

عقل کے ساتھ انسان غور وفکر کرتا ہے اور اسی کے ساتھ تمام ذرائع سے اپنے فائدے کیلئے استفادہ کرتا ہے اور اسی کے ذریعے آسمانوں کی بیکراں فضا میں بلندی حاصل کرتا ہے اور سمندروں کی گہرائیوں میں تیرتا ہے اور زمین میں تمام جمادات، نباتات اور حیوانات سے استفادہ کرتا ہے اور ان کو کام میں لاتا ہے حتیٰ کہ اپنے ہم جنسوں سے بھی حتی الامکان فائدہ اٹھاتا ہے۔

انسان اپنی فطری خاصیت اور عادت کے مطابق اپنی سعادت اور بہتری کو مکمل آزادی میں ہی دیکھتا ہے، لیکن چونکہ اس کی جسمی تنظیم ایک اجتماعی تنظیم ہے اور بے شمار ضروریات رکھتا ہے جن کے پیش نظر ہرگز اکیلا ان تمام ضروریات اور احتیاجات کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور اجتماعی طور پر اپنے دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر، کہ وہ بھی اسی طرح کی ضروریات مثلاً خودغرضی، آزادی اور دوستی کی خواہشات رکھتے ہیں ناگزیر اور مجبور ہے کہ اپنی آزادی کا کچھ حصہ دے یعنی سماجی تعاون کو مجبوری کی خاطر قبول کرلے۔

یہ حقیقت بچوں اور نابالغوں کے حالات پر نظر ڈالنے سے اور بھی زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ چھوٹے بچے شروع میں جب کوئی چیز لینا چاہتے ہیں تو ضد اور رونے کا سہارا لیتے ہیں اور کسی قانون یا اصول کو ہرگز قبول نہیں کرتے، لیکن جب ان کی عقل میں اضافہ ہوجاتا ہے تو آہستہ آہستہ سمجھ جاتے ہیں کہ زندگی کے کام کاج صرف زبردستی اور سرکشی کے ساتھ ہی انجام نہیں پاتے۔ اس طرح بتدریج ایک سماجی انسان کی حالت اختیار کرلیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک اجتماعی شخص کی عمر کو پہنچ کر، جو مکمل عقل اور غور وفکر رکھتا ہے اپنے ماحول کے اندر تمام سماجی اصولوں اور قوانین کے مطیع بن جاتے ہیں۔ انسان، باہمی تعاون پر مبنی معاشرے کو قبول کرنے کیلئے قانون کو ضروری جانتا ہے کہ جو معاشرے میں حکومت کرے اور ہر شخص کے فرائض کو معین کرتے ہوئے خلاف ورزی کرنے والوں کیلئے سزا معین کرے۔ یعنی ایک ایسا قانون جس کے عملی نفاذ کے ذریعے معاشرے کے تمام افراد حقیقی سعادت کو حاصل کریں اور وہ خوشحالی جو ان کی اجتماعی اقدار کے مطابق ہو، اس تک پہنچ جائیں۔

یہ قانون عملی اور عمومی قانون ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے آغاز سے لے کر آج تک ہمیشہ اس کا خواہاں اور شیفتہ رہا ہے اور ہمیشہ اس کو حاصل کرنے کی آرزو اور خواہش کرتا رہا ہے اور اس کو پانے کی

کوشش میں ہے۔ظاہر ہے کہ اگر ایسی چیز ممکن نہ ہوتی اور انسان کی تقدیر میں لکھی ہوئی نہ ہوتی تو انسان ہمیشہ اس کی خواہش نہ کرتا۔[1]

خداوند تعالیٰ نے اس انسانی معاشرے کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾

ہم نے معیشت اور زندگی کو انسانوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے (ہر متکفل بھی اسی معیشیت کا حصہ ہے) اور ان میں سے بعض کو برتری دی ہے تا کہ ان میں بعض لوگ، بعض دوسرے لوگوں کو مسخر کریں (ان پر غلبہ حاصل کریں)۔[2]

جیسا کہ ہر مزدور یا حاکم خاص موقعوں پر دوسروں کو مسخر کرتے ہیں اور اسی طرح افسر اور ماتحت، مالک اور مزارعہ یا خریدار اور بیچنے والا۔

اسی طرح قرآن مجید انسانی خودغرضی اور اجارہ داری کی خواہش کے متعلق فرماتا ہے:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝﴾

بے شک انسان حریص اور لالچی پیدا ہوا ہے، جب اس کو شر (مصیبت) اور ناگواری کا سامنا ہوتا ہے تو بے صبری کرتا ہے اور جب اس کو فائدہ ہوتا ہے تو دوسروں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔[3]

---

[1] دنیا کے تمام انسان حتیٰ کہ ان میں سے بہت ہی سادہ اور فکر سے عاری لوگ بھی اپنی فطرت کے مطابق چاہتے ہیں کہ یہ انسانی دنیا ایسی ہو جائے کہ تمام انسان اس میں صلح وصفا اور آرام وسکون کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ فلسفے کے مطابق: ''چاہنا، خواہش کرنا، رغبت کرنا اور بھوک وغیرہ''، ایسی صفات ہیں جن کو اضافی اور دوطرفہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً چاہنے والا اور جس کو چاہا جائے یا عاشق و معشوق وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ پسند کرنے یا عاشق ہونے کا امکان نہ ہوتا تو عاشق ہونا یا پسند کرنا کوئی معنی یا حقیقت نہ رکھتا اور آخر کار ہر ایسا نظریہ ''ادراک نقص'' کی طرف واپس نہ لوٹتا کیونکہ اگر کمال یا عروج وترقی ممکن نہ ہوتے تو نقص یا پستی کے کوئی معنی نہ ہوتے۔

[2] سورۂ زخرف، آیت ۳۲۔

[3] سورۂ معارج، آیت ۱۹۔۲۱۔

عقل اور قانون

اگر اچھی طرح سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ قانون جس کی انسان ہمیشہ آرزو وخواہش کرتا رہا ہے اور سبھی لوگ اپنی سعادت اور خوش بختی کیلئے انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی خداداد فطرت کی بنا پر جس قانون کی خواہش اور ضرورت محسوس کرتے ہیں، یہ وہی قانون ہے جو پوری انسانی دنیا کو انسانیت کی حیثیت سے کسی استثنا اور امتیاز کے بغیر سعادت تک پہنچائے اور یہی قانون تمام افراد کے درمیان عمومی حیثیت رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اب تک انسانی زندگی کے مختلف نشیب وفراز اور مختلف زبانوں میں وہ قانون جو عقل وخرد کے مطابق بنایا گیا ہو، لوگوں نے اس کو نہیں سمجھا اور اگر ایسا قانون فطرت کے مطابق اور تکوینی ہدایت کی طرف سے عقل کے سپرد کیا گیا ہوتا تو یقیناً ہر عقلمند انسان اس کو مکمل طور پر سمجھ سکتا تھا بلکہ وہ لوگ جو عقل رکھتے ہیں، ایسے قانون کو اچھی طرح تفصیل سے سمجھ سکتے تھے جیسا کہ معاشرے میں ایسے قانون کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔

واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہمہ گیر مکمل قانون جو اس انسانی معاشرے کی خوش حالی اور خوش بختی کی ضمانت دے اور اس کے ذریعے انسان فطرت اور حقیقی راستے کی طرف ہدایت حاصل کر سکے، اگر قدرتی اور فطری طور پر عقل کے دائرہ کار میں ڈال دیا گیا ہوتا تو ہر عقلمند انسان اس کو ضرور سمجھ سکتا تھا۔ جیسا کہ نفع، نقصان اور اپنی زندگی کی تمام دوسری ضروریات کو سمجھتا ہے، لیکن ایسے قانون کا آج تک کہیں سراغ نہیں ملتا اور وہ قوانین جو خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا ان کو کسی حکمران یا افراد اور قوموں نے بنایا ہے اور وہ آج انسانی معاشرے میں جاری اور نافذ ہیں، وہ سب کے سب ایک جماعت کیلئے فائدہ مند ہیں اور دوسری جماعت کیلئے نہیں۔ ایک جماعت ان قوانین سے مطلع ہے اور دوسری نہیں جانتی، لہٰذا تمام انسان جو انسانی لحاظ سے مساوی ہیں اور سب کے سب خداداد عقل رکھتے ہیں، ان قوانین کے بارے میں مشترکہ سوجھ بوجھ یا عقیدہ نہیں رکھتے۔

وحی یا مخفی شعور

گزشتہ بیان کے ذریعے واضح ہو گیا ہے کہ ایسا قانون جو تمام انسانی سعادت اور خوش بختی کو پورا کرنے کی ضمانت دے سکے، عقل اس کو سمجھنے سے قاصر ہے اور چونکہ ''عمومی ہدایت'' کے نظریئے کے

مطابق انسانوں میں ایسی سوجھ بوجھ کا ہونا، ضروری ہے تا کہ ایسے قانون سمجھ سکیں، پس ضروری ہے کہ انسانوں میں ایسے قانون کو سمجھنے کیلئے ایک مقیاس، پیمانہ یا آلہ ہونا چاہیے جو زندگی کے حقائق و فرائض کو اچھی طرح بیان کر سکے اور سب کی دسترس میں قرار دے۔ اس قسم کے شعور و ادراک کو جو ظاہری عقل و شعور اور احساس کے علاوہ ہے ''شعور وحی'' کہا جاتا ہے۔ البتہ ہر انسان میں اس طاقت کا پیدا ہونا ضروری نہیں ہے، کیونکہ ایسی طاقت تمام انسانوں میں پیدا نہیں ہوسکتی۔ مثلاً قوت باہ تمام انسانوں میں موجود ہے، لیکن شادی کی لذت کو سمجھنا اور شادی کرنا صرف اس وقت میسر آ سکتا ہے جب انسان سن بلوغ کو پہنچ جائے۔ اسی طرح وحی کا شعور ان افراد میں جو ان کو نہیں سمجھتے ''مرموز'' یعنی مخفی چیز ہے، بالکل اسی طرح جیسا کہ نابالغ افراد کیلئے شادی کی لذت کو سمجھنا مرموز ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں خصوصاً اپنی شریعت کی وحی اور اس کو سمجھنے میں عقل کی بے بسی کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ ۚ ... رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ﴾

ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی جیسا کہ نوحؑ اور نوحؑ کے بعد آنے والے تمام پیغمبروں پر وحی نازل کی۔۔۔ وہ پیغمبر جو انسانوں کو خوشخبری سناتے تھے اور خدا سے ڈراتے تھے تا کہ پیغمبروں کو بھیجنے کے بعد لوگوں کے پاس کوئی بہانہ نہ رہے۔[1]

اگر خدا کو پہچاننے کیلئے عقل کافی ہوتی تو اس کام کیلئے پیغمبروں کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔

انبیائے الٰہی کی عصمت

خدا کے پیغمبروں کا ظہور جیسا کہ گزشتہ فصل میں بیان ہوا ہے ''نظریہ وحی'' کی تائید اور تصدیق کرتا ہے۔ خدا کے پیغمبر ایسے انسان تھے جنہوں نے وحی اور نبوت کی دعوت اور تبلیغ کی۔ وہ اپنے دعوے کے بارے میں قاطع دلیل لاتے تھے اور خدا کے دین کے تمام پہلوؤں کو جو کہ سعادت اور خوشحالی بخشنے والا

[1] سورۂ نساء، آیت ۱۶۳۔ ۱۶۵۔

خدائی قانون ہے، لوگوں کو بتاتے تھے اور اسے خاص و عام کی دسترس میں پہنچاتے تھے۔ چونکہ پیغمبر، وحی اور نبوت کے مالک تھے اس لئے جب بھی وہ اس دنیا میں تشریف لاتے اور ظاہر ہوتے تو ان کی تعداد بیک وقت ایک یا چند افراد سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ خدائے تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کو پیغمبروں کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے مکمل کیا ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا کے ہر پیغمبر کو عصمت و طہارت کی صفت سے متصف ہونا چاہیے۔ یعنی خدا کی طرف سے وحی حاصل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے اور اس کو لوگوں تک پہنچانے کیلئے پیغمبر کو ہر خطا اور غلطی سے پاک ہونا چاہیے۔ اس کو گناہ (قانون خدا کی خلاف ورزی) نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے وحی کے معنی، اس کی حفاظت اور تبلیغ کے تین مراحل یا ارکان ہیں جو فطری ہدایت پر مبنی ہیں اور فطرت میں کسی قسم کی غلطی یا خطا کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دعوت و تبلیغ کے دعویدار (یعنی دعوت دینے والے) کی طرف سے ہر قسم کی غلطی یا خلاف ورزی خود مقاصد دعوت کے برعکس اور برخلاف اقدام ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس تبلیغ کی درستی اور حقیقت کے متعلق لوگوں کا یقین اور وثوق اٹھ جائے اور یہ امر آخر کار اس تبلیغ اور دعوت کے مقاصد اور غرض و غایت کو تباہ و برباد کرنے کا موجب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں پیغمبرں کی عصمت و طہارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

ہم نے پیغمبروں کو اپنے پاس جمع کیا (یعنی وہ ہمارے بغیر کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے اور نہ ہی اطاعت کرتے ہیں) اور ان کو ٹھیک راستے پر چلا دیا ہے۔[1]

اور پھر فرماتا ہے:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا

---

[1] سورۂ انعام، آیت ۸۷۔

رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ ﴾

صرف وہی (خدا تعالیٰ) غیب کا جاننے والا ہے اور وہ اپنے علم غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا، مگر اپنے پسندیدہ اور برگزیدہ بندوں کے (یعنی پیغمبروں کو) اور اس صورت میں آگے اور پیچھے سے ان (پیغمبر یا وحی) کی مکمل حفاظت کرتا ہے تا کہ خداوند تعالیٰ کے پیغامات بالکل اصلی حالت میں پہنچائیں۔[1]

انبیاءؑ اور آسمانی دین

جو کچھ خدا کے پیغمبروں کو وحی کے ذریعے حاصل ہوا اور انہوں نے پیغام و نصیحت کے طور پر انسانوں تک پہنچایا اس کو ''دین'' کہتے ہیں۔ یعنی زندگی کا طریقہ اور انسانی قوانین و فرائض جو انسان کی حقیقی سعادت کے ضامن ہیں۔

مجموعی طور پر ہر آسمانی دین دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے: عقائد اور اعمال۔

اعتقادی حصہ ایسے بنیادی عقائد اور حقیقت مبنی کے اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے جن پر انسان کو اپنی زندگی کی بنیاد رکھنی چاہیے اور وہ تین بنیادی اصول یا ارکان ہیں یعنی توحید، نبوت، معاد (قیامت اور حساب کتاب کا دن)۔ اگر ان تینوں میں سے کسی ایک میں بھی شک پیدا ہو جائے یا کمی واقع ہو جائے تو دین کی پیروی نہیں ہو سکتی۔

دن کا عملی حصہ ایسے اخلاقی اور عملی فرائض پر مبنی ہے جن میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فروعی فرائض جو آسمانی ادیان میں انسان کیلئے بنائے گئے ہیں وہ دو قسم کے ہیں: اخلاقیات اور شرعی اعمال۔ پھر یہ دونوں دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

الف۔ اخلاق اور اعمال کا ایک حصہ وہ ہے جو صرف خداوند تعالیٰ سے متعلق ہے: مثلاً صفت ایمان، اخلاص، تسلیم و رضا، خضوع و خشوع، نماز، روزہ اور قربانی وغیرہ۔ آخر الذکر تینوں (نماز، روزہ، قربانی) کو ''عبادات'' کہا جاتا ہے۔ بندگی اور خضوع انسان کو خدا کی بارگاہ میں مقرب بناتے ہیں۔

---

[1] سورۂ جن، آیت ۲۶۔۲۸۔

ب۔ نیک اعمال واخلاق کا دوسرا حصہ وہ ہے جو معاشرے سے متعلق ہے۔ مثلاً انسانوں سے محبت، خیر خواہی، انصاف، سخاوت، میل جول کے فرائض اور طریقے اور لین دین وغیرہ اور اس قسم کے اخلاق و اعمال کو ''معاملات'' (لین دین یا معاہدہ کرنا) کہا جاتا ہے۔

دوسری طرف انسان ہمیشہ اور بتدریج ترقی وکمال کی طرف متوجہ ہے اور انسانی معاشرہ آہستہ آہستہ مکمل تر ہوتا جارہا ہے۔ اس قسم کی تکمیل آسمانی شریعتوں اور ادیان میں بھی ضروری اور لازمی ہے۔ قرآن کریم اس تدریجی ارتقا کو (جیسا کہ عقلی لحاظ سے یہ بات ثابت ہے) تائید اور تصدیق کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی آیات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ نئی شریعت، گزشتہ شریعت سے کامل اور جامع تر ہوتی ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾

اور ہم نے کتاب (قرآن) کو تم پر نازل کیا ہے جو گزشتہ کتابوں (توریت اور انجیل وغیرہ) کو پیش نظر رکھتی اور ان کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر تسلط اور برتری رکھتی ہے۔[1]

البتہ جیسا کہ علمی نظریات اور عقائد سے پتا چلتا ہے اور قرآن کریم بھی اس کی وضاحت کرتا ہے، انسانی معاشرے کی زندگی، اس کائنات اور دنیا میں ابدی اور ہمیشگی نہیں ہے، لہٰذا فطری طور پر اس قسم کا ارتقا لامتناہی نہیں ہوگا۔ اسی طرح عمل اور اعتقاد کے لحاظ سے تمام انسانی فرائض وذمہ داریوں کا سفر بھی ایک انتہا تک پہنچ کر ختم ہوجائے گا اور نتیجتاً نبوت اور شریعت کا سلسلہ بھی اعتقادی اور عملی لحاظ سے اپنی ارتقائی اور کمال کی آخری حد کو پہنچ کر ختم ہوجائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس موضوع کو واضح کرنے کیلئے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین اسلام، تمام آسمانی ادیان سے مکمل تر اور آخری دین ہے، اپنے آپ کو ناقابل منسوخ کتاب کے طور پر، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری پیغمبر اور خاتم الانبیاء کے طور پر اور دین اسلام کو تمام انسانی اور الٰہی فرائض

[1] سورۂ مائدہ، آیت ۴۸۔

پر مشتمل بیان فرماتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝﴾

اور یقیناً قرآن ایسی کتاب ہے جو بہت ہی پیاری اور کسی باطل چیز کو آگے یا پیچھے سے قبول نہیں کرتی بلکہ پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی (باطل اس کتاب میں راہ پیدا نہیں کرسکتا)۔[1]

اور پھر فرماتا ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ﴾

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، بلکہ وہ خدا کے رسول اور آخری پیغمبر ہیں۔[2]

اور پھر فرماتا ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾

اور ہم نے تمہاری طرف کتاب بھیجی ہے جو ہر چیز کو واضح کرنے والی ہے۔[3]

پیغمبر اور وحی و نبوت کی حجت

موجودہ زمانے میں وحی اور نبوت کے بارے میں تحقیق کرنے والے بہت سے دانشوروں نے وحی، نبوت اور ان سے متعلقہ مسائل کو معاشرے کے نفسیاتی اصولوں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کے پیغمبر، پاک فطرت، بلند ہمت اور خلائق دوست انسان ہیں جنہوں نے انسانوں کو مادی اور معنوی ترقی اور برے معاشروں کی اصلاح کیلئے قوانین بنائے ہیں اور لوگوں کو ان کی طرف

---

[1] سورۂ حم، آیت ۴۱۔ ۴۲۔

[2] سورۂ احزاب، آیت ۴۰۔

[3] سورۂ نحل، آیت ۸۹۔

دعوت دی ہے۔ چونکہ اس زمانے کے لوگ عقل اور منطق کو قبول نہیں کرتے تھے، اس لئے انہوں نے لوگوں کی اطاعت اور فرمانبرداری حاصل کرنے کیلئے ان قوانین کو عالمِ بالا (خدا) سے منسوب کر دیا ہے اور اپنی پاک روح کو روح القدس اور اس سے حاصلہ افکار کو وحی و نبوت اور مطلوبہ فرائض کو آسمانی یا خدائی شریعت کا نام دیا ہے اور جن بیانات اور کلام کے ذریعے یہ تمام بتائے جاتے ہیں ان کو ''کلام خدا'' یا ''آسمانی کتاب'' کہہ دیا ہے۔

مگر جو شخص پورے انصاف کے ساتھ آسمانی کتابوں اور خصوصاً قرآن مجید میں گہرے غور و فکر سے اور اسی طرح پیغمبروں کی شریعتوں میں توجہ کرے تو بلاشک و شبہہ اسے معلوم ہوگا کہ یہ نظریہ ٹھیک نہیں ہے۔ خدا کے پیغمبر سیاست دان نہیں تھے بلکہ وہ مردان حق تھے اور ان میں سراپا صدق و صفا موجود تھا۔ وہ جس چیز کو حاصل کرتے تھے اس کو کسی کمی بیشی کے بغیر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور جو کچھ فرماتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے اور جس چیز کا دعویٰ کرتے تھے وہ ایک مرموز شعور (وحی) تھا جو غیبی امداد کے ساتھ ان تک پہنچتا تھا اور اس کے ذریعے وہ لوگوں کے فرائض و اعمال کو خداوند تعالیٰ سے حاصل کر کے لوگوں کے درمیان اس کی تبلیغ کرتے تھے۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دعوائے نبوت کو ثابت کرنے کیلئے حجت، دلیل اور ثبوت ضروری ہے۔ اگر وہ شریعت جو ایک پیغمبر لاتا ہے، اس کا محض عقلی اصولوں کے ساتھ مطابقت رکھنا اس کے دعوائے پیغمبری کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ جو شخص پیغمبری اور نبوت کا دعویٰ کرتا ہے وہ اپنی شریعت کے حقیقی ہونے کے دعوے کے علاوہ ایک اور دعویٰ بھی کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وحی و نبوت کے ذریعے عالم بالا سے تعلق اور رابطہ رکھتا ہے اور وہ خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ یہ دعویٰ بجائے خود الگ سے ثبوت اور دلیل چاہتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ (جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے) ہمیشہ لوگ اپنے سادہ افکار اور ذہنوں کے ساتھ خدا کے پیغمبروں سے ان کے دعوائے نبوت اور پیغمبری کو ثابت کرنے کیلئے معجزے چاہتے تھے۔

اس سادہ اور ٹھیک منطق کے معنی یہ ہیں کہ وہ وحی اور نبوت جن کا ایک پیغمبر یا نبی دعویٰ کرتا ہے اور

تمام دوسرے انسانوں میں جو اس کی طرح انسان ہیں یہ بات موجود نہیں ہے تو مجبوراً اس کو ایک ایسی غیبی طاقت ماننا پڑے گا جو خدا کی طرف سے مافوق الفطرت ذرائع سے پیغمبر کو ملتی ہے اور پیغمبر اس کے ذریعے سے خدا کے کلام کو سن کر اپنی رسالت کے مطابق اسے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ اگر یہ سب ٹھیک ہے تو پیغمبر کو چاہیے کہ اپنے خدا سے ایک دوسری مافوق الفطرت چیز مانگے اور اسے لوگوں کے سامنے پیش کرے تا کہ لوگ اس کے ذریعے پیغمبر کی پیغمبری اور نبی کی نبوت وصداقت پر ایمان لے آئیں۔

جیسا کہ معلوم ہے پیغمبروں سے معجزے کی درخواست ایک ٹھیک اور درست منطق کے مطابق ہے اور خدا کا پیغمبر اپنی نبوت کے اثبات کے شروع ہی میں یا لوگوں کی درخواست کے بعد معجزہ دکھائے۔

البتہ بہت سے محققین نے معجزے (مافوق الفطرت امر) کا انکار کیا ہے لیکن ان کے دلائل اور کلام ٹھوس نہیں اور علل واسباب جو موجودہ زمانے تک ہونے والے حوادث وواقعات کے بارے میں تجربے اور تحقیق کے ذریعے ہمیں معلوم ہوئے ہیں، ان کے متعلق ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ آیا یہی اسباب دائمی ہیں اور ان کے علاوہ ہرگز کوئی اور سبب یا حادثہ کسی اور طرح سے یا دوسرے علل واسباب کے ذریعے رونما نہیں ہوسکتا؟۔ نیز یہ امر بھی اپنی جگہ ثابت ہے کہ وہ معجزات جن کو پیغمبروں نے خدا سے منسوب کیا ہے، محال اور عقل کے خلاف نہیں ہیں (جیسا کہ تین کا عدد جفت نہیں ہوسکتا) بلکہ خارق العادت یا مافوق الفطرت ہیں اور یہ خارق العادت یا کرامات، ریاضت اور مجاہدہ کرنے والے افراد کے حوالے سے بہت زیادہ دیکھی اور سنی گئی ہیں۔

پیغمبرانِ الٰہی کی تعداد

تواریخ کے مطابق اس دنیا میں بہت زیادہ پیغمبر تشریف لائے ہیں اور قرآن مجید میں ان میں سے اکثر اور بہت زیادہ پیغمبروں کی تصدیق کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک جماعت کا نام بھی لیا گیا ہے، لیکن تمام پیغمبروں کے حقیقی اور معین تعداد کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔ کسی قطعی یا حتمی کتاب میں بھی پیغمبروں کی حقیقی تعداد بیان نہیں کی گئی سوائے اس کے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی مشہور روایت یا حدیث میں جو انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کی ہے، لکھا ہے کہ پیغمبروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔

اولوالعزم اور صاحب شریعت پیغمبر

قرآن کریم کے مطالب سے حاصل ہونے والے نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے تمام پیغمبر شریعت نہیں لائے ہیں، بلکہ ان میں سے صرف پانچ پیغمبر یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی اولوالعزم اور صاحب شریعت پیغمبر ہیں اور دوسرے تمام پیغمبر شریعت میں ان اولوالعزم پیغمبروں کے تابع تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى﴾

خداوند تعالیٰ نے تمہارے لئے اسی دین کی شریعت بھیجی ہے جو نوحؑ پر نازل کی تھی اور جو تم پر نازل کی ہے اور جو ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ پر نازل کی تھی۔[1]

واضح رہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کو بیان کر رہی ہے اور ظاہر ہے کہ اگر ان پیغمبروں کے علاوہ کوئی اور صاحب شریعت پیغمبر بھی ہوتا تو اس کا ذکر بھی اس آیت میں ہوتا۔

ایک اور آیہ مجیدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ﴾

اور جب ہم نے باقی پیغمبروں سے وعدہ لے لیا تھا (بیعت لے لی تھی) اور تم سے اور نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سے بھی پکا وعدہ لے لیا تھا۔[2]

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت

خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو صاحب کتاب و شریعت ہیں اور مسلمان آپؐ پر ایمان لائے ہیں۔ آنحضرت ہجرت سے ترپن (۵۳) سال پہلے حجاز کے شہر مکہ میں قریش کی شاخ

---

[1] سورۂ شوریٰ، آیت ۱۳۔

[2] سورۂ احزاب، آیت ۷۔

بنی ہاشم میں سب سے باعزت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپؐ کے والد ماجد حضرت عبداللہؑ اور والدہ ماجدہ حضرت آمنہؑ تھے۔ آپؐ ابھی بچے ہی تھے کہ والد ماجد اور والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد آپؐ اپنے دادا حضرت عبدالمطلبؑ کی سرپرستی میں آ گئے۔ حضرت عبدالمطلبؑ بھی جلد ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئے جس کے بعد آپؐ کے چچا حضرت ابوطالبؑ نے آپؐ کی سرپرستی اور دیکھ بھال اپنے ذمے لی اور آپؐ کو اپنے گھر لے گئے۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا حضرت ابوطالبؑ کے گھر پرورش پائی اور بڑے ہوئے۔ ابھی آپؐ کمسن ہی تھے کہ اپنے چچا کے ہمراہ تجارت کی غرض سے شام تشریف لے گئے۔ آپؐ نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا، لیکن سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد آپؐ باعقل، باادب اور امانت دار مشہور ہو گئے تھے۔ عقل و امانت کے نتیجے میں ہی خاندانِ قریش کی دولت مند خاتون (خدیجہؑ) نے آپؐ کو اپنے مال کا سرپرست بنا دیا تھا۔ اسی طرح تجارت اور لین دین کے تمام کام آپؐ کے سپرد کر دیئے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے مالِ تجارت کے ساتھ دوبارہ شام کا سفر کیا اور اپنی عقل و دانش کے ذریعے بہت زیادہ منافع حاصل کیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس خاتون نے آنحضرت ﷺ کو شادی کی پیشکش کی جسے آپؐ نے قبول کر لیا۔ شادی کے بعد سے جو پچیس سال کی عمر میں ہوئی، چالیس سال کی عمر تک آپؐ یہی کام کرتے رہے۔ آپؐ نے عقل مندی اور امانت داری میں بہت زیادہ شہرت حاصل کر لی تھی، لیکن آپؐ بتوں کی پوجا نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں عرب کا عام مذہب بت پرستی تھا۔ آپؐ کبھی کبھی خلوت اور تنہائی میں جا کر اپنے خدا سے راز و نیاز کیا کرتے تھے۔ چالیس سال کی عمر تک (مکہ معظمہ کے نزدیک تہامہ پہاڑوں کے اندر ایک غار) غارِ حرا میں جا کر تنہائی میں خدا کی عبادت کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ پر وحی الٰہی کا سلسلہ شروع ہوا اور آپؐ کے ذمے تبلیغ کا کام لگا دیا گیا۔ اس موقع پر قرآن مجید کی پہلی سورت (سورۂ علق) کی ابتدائی آیات آپؐ پر نازل ہوئیں۔ اسی دن آپؐ اپنے گھر تشریف لائے اور راستے میں اپنے چچا زاد بھائی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو دیکھا اور تمام واقعہ بیان کیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے فوراً آپؐ کی تصدیق کر دی اور جب آپؐ گھر کے اندر تشریف لائے تو آپؐ

کی بیوی (حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا) بھی آپؐ پر ایمان لے آئیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب پہلی بار لوگوں کی ایک جماعت کو دین اسلام کی دعوت دی تو آپؐ بہت ہی شدید اور دردناک ردعمل سے دوچار ہوئے، لہٰذا مجبوراً ایک عرصے تک پوشیدہ اور خفیہ طور پر تبلیغ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دوبارہ خدا کی طرف سے آپؐ کو حکم ملا کہ اپنے نزدیکی رشتہ داروں کو دین اسلام کی طرف بلائیں، لیکن اس تبلیغ کا بھی کوئی فائدہ اور نتیجہ نہ نکلا اور حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سوا کوئی شخص مسلمان نہ ہوا[1]۔ اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم کے مطابق اپنی تبلیغ کا کام اعلانیہ شروع کر دیا۔ اس اعلانیہ تبلیغ کے ساتھ اہل مکہ کی طرف سے شدید ردعمل، آزار واذیت اور دوسری تکلیفیں شروع ہوگئیں جو پہاڑ بن کر آپؐ اور آپؐ کے پیروکار نئے مسلمانوں پر نازل ہونے لگیں۔

قریش کی طرف سے سختیاں اور تکلیفیں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ بہت سے مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چچا حضرت ابوطالبؑ اور بنو ہاشم خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ شعب ابوطالب میں (جو مکہ کی ایک وادی میں ایک قلعہ تھا) محصور ہو گئے اور نہایت سختی اور تنگی کی حالت میں زندگی گزارتے رہے۔ قریش خاندان میں سے کوئی شخص بھی ان سے میل جول اور لین دین نہ رکھتا تھا اور نہ ہی آپؐ اس قلعے سے باہر آنے کی طاقت رکھتے تھے۔

مکہ کے بت پرست اور مشرک لوگ ہر قسم کے دباؤ، ایذاء، مارنے پیٹنے، گستاخی کرنے، مذاق اڑانے، رخنہ اندازیوں اور ہر قسم کی دوسری تکالیف دینے سے گریز نہیں کرتے تھے اور کبھی کبھی آپؐ کو اسلام کی تبلیغ اور دعوت سے باز رکھنے کیلئے نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے آپؐ کو بہت زیادہ مال و دولت اور سلطنت وامارت وغیرہ کی لالچ بھی دیتے تھے، لیکن آنحضرتؐ کی نظر میں ان لوگوں کے وعدے اور تکلیفیں برابر تھے اور یہ سب چیزیں آپؐ کی ہمت وارادے اور عزم میں اضافہ کرتی تھیں۔

---

[1] واضح رہے کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی دستاویزات، اسناد واحادیث اور ایسے ہی حضرت علی علیہ السلام کے اشعار کے حوالے سے شیعہ معتقد ہیں کہ حضرت ابوطالبؑ ایمان لے آئے تھے مگر چونکہ وہ پیغمبر اکرمؐ کے اکیلے حامی تھے، اس لئے اپنے دین (اسلام) اور ایمان کو لوگوں سے چھپا کر رکھتے تھے تاکہ قریش میں اپنی ظاہری طاقت کو محفوظ رکھ سکیں۔

ایک دفعہ بت پرست لوگ آپؐ کے پاس آئے اور انہوں نے بہت زیادہ مال و دولت، امارات اور سلطنت کا وعدہ دیا تو آنحضرت ﷺ نے مثال کے طور پر ان سے فرمایا:

''خدا کی قسم! جس کے ہاتھ اور اختیار میں میری جان ہے، اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دو تو بھی خداوند تعالیٰ کی عبادت، اطاعت اور اپنے مشن سے ہاتھ نہیں کھینچوں گا''۔

آنحضرت ﷺ اپنی بعثت کے تقریباً دسویں سال میں شعب ابی طالبؑ سے باہر آئے۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد آپؐ کے چچا حضرت ابوطالبؑ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے اور اسی طرح آپؐ کی وفادار بیوی حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا بھی اس دار فانی سے کوچ فرما گئیں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ کیلئے کوئی پناہ گاہ اور امن کی جگہ نہ رہی۔ مکہ کے بت پرستوں اور مشرکوں نے آپؐ کو قتل کرنے کا خفیہ منصوبہ بنایا اور رات کے وقت چاروں طرف سے آپؐ کے مکان کو گھیرے میں لے لیا تاکہ رات کے آخری حصے میں ایک حملہ کر کے آپؐ کو بستر مبارک پر ہی قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔

مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس واقعے کی اطلاع دے دی اور حکم دیا کہ یثرب (مدینے) کی طرف ہجرت کر جائیں۔ آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے بستر مبارک پر سونے کا حکم دیا اور خود خدا تعالیٰ کی حفاظت میں اپنے گھر سے نکلے اور دشمنوں کے محاصرے میں سے گزر کر مکہ سے چند فرسخ[1] کے فاصلے پر ایک غار میں پناہ لی۔ تین رات دن تک دشمن آپؐ کی تلاش میں لگے رہے اور جب آپؐ کو گرفتا کرنے میں ناامید ہو گئے تو واپس مکہ لوٹ گئے۔ تب آپؐ غار سے باہر نکلے اور یثرب (مدینہ) روانہ ہو گئے!

اہل یثرب کے بزرگ پہلے ہی آنحضرت ﷺ پر ایمان لے آئے تھے اور آپؐ کی بیعت کر چکے تھے۔ انہوں نے آپؐ کا پرجوش استقبال کیا اور اپنے جان و مال کو آپؐ کے اختیار میں دے دیا۔

آنحضرت ﷺ نے پہلی بار یثرب (مدینہ) میں ایک چھوٹے سے اسلامی معاشری کی بنیاد رکھی اور مدینہ کے اردگرد سکونت رکھنے والے یہودی قبیلوں اور اسی طرح اس علاقے کے طاقتور عرب قبیلوں کے ساتھ بھی معاہدے کئے اور پھر اسلام کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح یثرب ''مدینۃ النبی'' کے

---

[1] ایک فرسخ چھ کلومیٹر کے برابر ہوتا ہے۔

نام سے مشہور ہو گیا۔

اسلام دن بہ دن ترقی اور وسعت پیدا کر رہا تھا۔ مکہ کے مسلمان جو قریش کے ظلم و ستم میں گرفتار تھے، وہ آہستہ آہستہ اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کر کے شمع رسالت کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو رہے تھے۔ ان کو ''مہاجرین'' کہا جاتا تھا۔ اسی طرح یثرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مددگاروں کو ''انصار'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

اسلام بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا، لیکن اس کے باوجود قریش کے بت پرست اور حجاز کے یہودی قبیلے رکاوٹوں اور جنگوں سے باز نہیں آتے تھے۔ وہ ان منافقوں کے ساتھ مل کر جو مسلمانوں میں داخل ہو گئے تھے اور کسی طرح بھی پہچانے نہیں جاتے تھے، مسلمانوں کیلئے ہر روز ایک تازہ مصیبت پیدا کرتے رہتے تھے، یہاں تک کہ آخر کار جنگوں کی نوبت آئی اور مسلمانوں اور عرب کے بت پرستوں اور یہودیوں کے درمیان بہت سی جنگیں لڑی گئیں جن میں فتح اسلامی لشکر کو ہی نصیب ہوتی تھی۔ ان چھوٹی اور بڑی جنگوں کی تعداد اسی (۸۰) سے زیادہ تھی جن میں جنگ بدر، جنگ اُحد، جنگ خندق اور جنگ خیبر وغیرہ بہت ہی مشہور ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام جنگوں میں اکثر خود موجود ہوتے تھے۔ تقریباً تمام بڑی خونی جنگوں اور ایسے ہی بہت زیادہ چھوٹے بڑے معرکوں میں حضرت علی علیہ السلام کی وجہ سے ہی فتح ہوتی تھی۔ آپؑ ایسے شخص تھے کہ ان تمام جنگوں میں ہرگز پیچھے نہ رہتے تھے۔ ان تمام جنگوں میں جو ہجرت کے بعد دس سال کے عرصے میں لڑی گئیں، مسلمانوں میں سے دوسو سے کم تر افراد شہید ہوئے اور کافروں میں سے ایک ہزار سے کم تر مارے گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کارکردگی، مہاجرین اور انصار کی فداکاریوں اور جانثاریوں کی وجہ سے ہجرت کے بعد دس سال کے عرصے میں اسلام تمام جزیرۃ العرب میں پھیل گیا۔ اس مدت میں دوسرے تمام ممالک مثلاً ایران، روم، مصر اور حبشہ وغیرہ کے بادشاہوں کو تبلیغی خطوط لکھے گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غریبوں کے ساتھ غریبوں کی سی زندگی گزارتے تھے اور اپنی اس فقیری پر فخر کیا کرتے تھے[1] اور اپنی زندگی میں ایک لمحہ بیکار نہ رہتے تھے۔ آپؐ نے اپنے وقت کو تین حصوں میں تقسیم

---

[1] آپؐ کی مشہور حدیث ہے: الفقر فخری: ''فقر ہی میرا فخر ہے''۔

کر رکھا تھا۔ ایک حصہ تو خدا کیلئے مخصوص تھا یعنی عبادات اور خدا کی یاد میں گزارتے تھے، دوسرا حصہ اپنے اہل خاندان اور گھر کی ضروریات کیلئے وقف تھا اور تیسرا حصہ لوگوں کیلئے تھا۔ اس حصے کو آپؐ اسلامی معارف کی تعلیم، اسلامی معاشرے کے کاموں اور اس کی اصلاح میں صرف کیا کرتے تھے اور مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنے اور داخلی اور خارجی تعلقات کو مضبوط بنانے اور دوسرے تمام ریاستی امور میں صرف کیا کرتے تھے۔

مدینہ میں دس سال قیام کے بعد آنحضرت ﷺ اس زہر کی وجہ سے جو ایک یہودی عورت نے آپؐ کے کھانے میں ڈال کر کھلایا تھا کمزور ہوتے گئے اور چند دن بیماری کے بعد آپؐ رحلت فرما گئے۔ جیسا کہ احادیث و روایات میں موجود ہے کہ آپؐ کی زبان مبارک سے جو آخری الفاظ نکلے وہ عورتوں اور غلاموں کے (ساتھ بہتر سلوک کرنے کے) بارے میں وصیت تھی۔[1]

پیغمبر اکرمؐ اور قرآن مجید

عوام، دوسرے پیغمبروں کی طرح پیغمبر اکرم ﷺ سے بھی معجزہ طلب کیا کرتے تھے اور آنحضرتؐ خود بھی معجزات کی تصدیق فرماتے تھے، جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر ان کی تصدیق ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ سے بھی بہت زیادہ معجزے رونما ہوئے اور ان میں سے بعض مسلم اور قابل اعتماد ہیں، لیکن آپ کا ہمیشہ باقی رہنے والا زندہ اور جاوید معجزہ ''قرآن کریم'' ہے جو آپؐ پر نازل ہونے والی الہامی اور آسمانی کتاب ہے۔ یہ خدائی کتاب چھ ہزار سے زیادہ آیات پر مشتمل ہے اور اس میں ایک سو چودہ چھوٹی بڑی سورتیں ہیں۔

قرآن کریم کی آیات کریمہ آنحضرت ﷺ کی تئیس سالہ نبوت اور بعثت کے دوران بتدریج نازل ہوئی ہیں اور اس کی ہر آیت یا مکمل سورت رات، دن، سفر، حضر، جنگ، صلح یا مختلف سختی اور آسودگی کے زمانے میں وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے۔

---

[1] آنحضرت ﷺ کے بارے میں مطالب کے سلسلے مزید تفصیل کیلئے سیرت ابن ہشام، سیرت حلبی اور بحار الانوار جلد ۶ وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔

قرآن مجید اپنی بہت زیادہ آیات میں واضح طور پر اپنے آپ کو معجزہ کہتا ہے اور تاریخی شہادت کے مطابق اس زمانے میں عرب کے لوگ جو فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین درجے پر پہنچ چکے تھے اور اپنی زبان کی مٹھاس اور روانی کی وجہ سے شعر و شاعری اور تحریر و تقریر کے میدان میں داد سخن دیا کرتے تھے، ان کو مقابلے کیلئے طلب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید ایک انسان کا ساختہ و پرداختہ ہے، یعنی خود حضرت محمد ﷺ نے اس کو اپنی طرف سے بیان کیا ہے یا آپؐ نے کسی اور سے سیکھا ہے اور اس کی تعلیم حاصل کی ہے تو اس (قرآن) کی طرح کی کوئی کتاب[1]، یا اس کی سورتوں کی طرح کی دس سورتیں[2] یا حتیٰ ایک سورت[3] ہی بنا کر لے آئیں اور اس کام کیلئے ہر ممکن ذرائع سے استفادہ کریں۔

مگر عرب کے نامور سخنوروں اور ادیبوں نے اس چیلنج کے مقابلے میں جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ: ''یہ سب جادو ہے اور ہماری طاقت سے باہر ہے''۔ جیسا کہ ایک مشہور عربی شاعر ولید کے بارے میں سورۂ مدثر میں آیا ہے کہ اس نے بڑے غور و خوض کے بعد حق سے منہ موڑ کر سرکشی شروع کر دی اور کہنے لگا:

﴿إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ۝ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝﴾

یہ قرآن سوائے جادو کے اور کچھ نہیں اور یہ قرآن انسانی کلام کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔[4]

قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت کیلئے ہی چیلنج اور مقابلے کیلئے طلب نہیں کرتا، بلکہ کبھی کبھی معنی

---

[1] ارشاد ہوا: ﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ۝﴾: ''اگر وہ سچے ہیں تو قرآن کی مانند کلام لائیں''۔ (سورۂ طور، آیت ۳۴)

[2] جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾: ''کہتے ہیں محمد ﷺ نے قرآن کو جھوٹ موٹ خدا سے منسوب کر دیا ہے، اے نبیؐ! کہہ دو کہ اگر جھوٹ اور تہمت ہے تو قرآن کی مانند دس سورتیں لا کر دکھاؤ اور اس کام کیلئے جس سے چاہو مدد حاصل کر سکتے ہو''۔ (سورۂ ہود، آیت ۱۳)

[3] ارشاد قرآنی ہے: ﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ﴾: ''یا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے پیغمبر نے گڑھ لیا ہے تو کہہ دیجئے کہ تم اس کے جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ''۔ (سورۂ یونس، آیت ۳۸)

[4] سورۂ مدثر، آیت ۲۴۔۲۵۔

کے لحاظ سے بھی مقابلے کی پیش کش کرتا ہے اور جنوں و انسانوں کی فکری اور علمی طاقت کو مقابلے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کتاب دنیاوی زندگی کے مکمل ضابطۂ حیات پر مشتمل ہے اور اگر اس میں غور و خوض یا تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ وسیع پروگرام جس میں انسانی زندگی کے تمام اعتقادات، اخلاق و اعمال کے تمام پہلو شامل ہیں اور ان تمام صفات کے چھوٹے چھوٹے اجزا کو بھی مدنظر قرار دیا گیا ہے، یہ برحق اور خدا کی طرف سے ہے اور اس کو ''دین حق'' کہتے ہیں۔ یعنی اسلام ایسا دین ہے جس کے اصول و قوانین، حقیقت اور حقیقی صلاح سے سرچشمہ حاصل کرتے ہیں نہ کہ اکثریت کی خواہشات یا عوام میں سے ایک شخص کے ارادوں سے مثلاً ایک طاقتور اور حکمران انسان کی خواہشات سے۔

اس وسیع پروگرام کی بنیاد بہت ہی عزیز و گرامی لفظ ''حق'' جس کے معنی ایک خدا پر ایمان ہے پر رکھی گئی ہے اور اس کے تمام اصول و معارف، توحید (ایک خدا پر ایمان رکھنا) سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد پسندیدہ ترین انسانی اخلاق اصول و معارف سے حاصل کر کے ان کو پروگرام کا جز بنا دیا گیا ہے۔ پھر انسانی اعمال کے بے شمار کلی اور جزوی اصول، انفرادی اور اجتماعی حالات کا مطالعہ اور اس سے متعلقہ فرائض جو ایک خدا کی پرستش اور عبادت سے سرچشمہ حاصل کرتے ہیں، بنائے گئے ہیں۔

دین اسلام میں اصول و فروع کے درمیان ایسا رابطہ موجود ہے کہ ہر قسم کے فرعی حکم کا اگر تجزیہ اور مطالعہ کیا جائے تو وہ توحید کی طرف واپس لوٹتا ہے اور فرعی اصول و احکام کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھا جائے تو نتیجہ توحید ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔

البتہ ایسے وسیع اور منظم آئین اور قانون کی ترتیب اور تشکیل تو درکنار اس کی ابتدائی فہرست تیار کرنا بھی عام حالات میں ایک عام آدمی کی طاقت سے باہر ہے، خواہ وہ دنیا کا کتنا بڑا قانون دان ہی کیوں نہ ہو، تو اس شخص کی تو بات ہی دوسری ہے جو بہت کم عرصے میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مسائل، جانی، مالی، ذاتی، عمومی مشکلات کے علاوہ خونی جنگوں، اندرونی اور بیرونی سازشوں اور رکاوٹوں میں پھنس کر آخر کار دنیا کے مقابلے میں اکیلا اور تنہا رہ گیا ہو۔

اس کے علاوہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا اور نہ کسی سے تعلیم حاصل کی تھی اور دعوتِ اسلام سے پہلے اپنی دو تہائی زندگی بھی اس قوم کے درمیان گزاری تھی جو تہذیب و تمدن سے بالکل

عاری تھی[1] بلکہ اس قوم میں تہذیب وتمدن کی بوتک بھی موجود نہ تھی اور وہ قوم خشک، بنجر اور ریگستانی زمین میں سخت گرم آب وہوا کے اندر ناگفتہ بہ حالت میں زندگی گزارتی تھی اور ایسے ہی ہر روز اپنے ہمسایہ ممالک کی حکومتوں میں سے ایک کے زیر تسلط رہی تھی۔

ان سب کے علاوہ قرآن مجید ایک دوسرے طریقے سے چیلنج کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ کتاب جو بتدریج مختلف حالات وشرائط میں گوناگوں مشکلات، آسودگی، آرام، جنگ، صلح، طاقت، کمزوری وغیرہ کے دوران تیئس سال کی مدت میں نازل ہوئی اگر یہ کتاب خدا کی طرف سے نہ ہوتی تو اس میں ضرور تناقص اور تضاد موجود ہوتا اور لامحالہ اس کا آخری حصہ پہلے حصے سے بہتر ہوتا جیسا کہ انسانی تکمیل کا لازمہ ہے، لیکن اس کتاب (قرآن) کی مکی آیات اور مدنی آیات یکساں ہیں اور اس کا آخری حصہ ابتدائی حصے سے کوئی فرق نہیں رکھتا اور یہ کتاب متشابہ الاجزا (جس کے تمام اجزا مشابہ اور مانند ہوں) ہے اور اپنی حیرت انگیز بیانی اور کلامی طاقت میں ایک ہی نہج اور طریقے پر ہے۔ جیسا ارشاد الٰہی ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿٨٢﴾﴾

کیا یہ لوگ قرآن مجید میں تدبر اور غور وخوض نہیں کرتے؟ اگر یہ قرآن خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے نازل ہوا ہوتا تو انہیں اس میں بہت زیادہ اختلاف نظر آتا۔[2]

*****

---

[1] اللہ تعالیٰ پیغمبر اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے فرماتا ہے: ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾﴾: ''میں قرآن مجید کے نازل ہونے سے پہلے ایک عمر تک تمہارے درمیان زندگی گزارتا رہا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے''؟ (سورۂ یونس، آیت ۱۶)

اور پھر فرماتا ہے: ﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ﴾: ''قرآن مجید نازل ہونے سے پہلے لکھے ہوئے کو نہیں پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے ہاتھوں سے لکھ سکتا تھا''۔ (سورۂ عنکبوت، آیت ۴۸)

اور پھر فرماتا ہے: ﴿وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾: ''اور اگر تم اس قرآن کے بارے میں شک کرتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو تم بھی (ایسے شخص سے جو ویسی ہی شرائط رکھتا ہو، یعنی جس نے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا ہو یا جس کا کوئی تعلیم دینے والا نہ ہو) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ایسی سورت لکھ کر لاؤ تاکہ معلوم ہو جائے کہ قرآن مجید خدا کا کلام نہیں ہے۔ (سورۂ بقرۃ، آیت ۲۳)

[2] سورۂ نساء، آیت ۸۲۔

قیام حسینی کے اہداف ومقاصد

حجۃ الاسلام مولانا غلام حسین عدیل

انسان کی شخصیت میں نکھار اعمال وکردار کے اہداف ومقاصد سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ مقصدیت، گفتار وکردار میں روح پھونکتی ہے۔ انسان کے کاموں میں ایک نیا رنگ اور نئی سمت پیدا کرتی ہے اور انسان کا جیسا مقصد ہوتا ہے ایسی ہی اس کی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ دنیوی مقصد اور الٰہی مقصد میں فرق ہے اور دونوں کے اثرات بھی مختلف ہیں۔ دنیا کو مقصد بنانے والے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کو مقصد قرار دینے والے اپنی فکر اور سوچ کے لحاظ سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ بنابریں انسان کا معیار زندگی اس کے ہدف ومقصد پر دلیل بنا کرتا ہے اور اختلاف اقدار صرف مقاصد کے مختلف ہونے سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے۔

حُب ذات، حبّ جاہ وریاست رکھنے والے اور دنیا پرست اپنی تمام کوششیں اور کاوشیں جائز ناجائز سبھی اعتبار میں حصول دنیا، مال وزر اور مادیات کیلئے وقف کرتے ہیں۔ ان کیلئے کامیابی وناکامی اور نفع ونقصان کا معیار دنیا ہوتا ہے مگر اہل اللہ کا مقصد فقط اور فقط ذات الٰہی کی خوشنودی ہوا کرتا ہے۔ عبودیت وبندگی الٰہی ان کا شعار ہوتا ہے۔ وہ اپنی کامیابی کا راز ذات پروردگار کی خوشنودی ورضا کو جانتے ہیں۔ وہ دنیا کی ناکامی اور مخالفت کو ہیچ شمار کرتے ہیں۔

اس تمہید سے قیام حسینی کے اغراض ومقاصد کی تفسیر وتشریح ہوجاتی ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے قیام کی تحلیل وتفسیر کو کسی مورّخ، مبلّغ اور خطیب کیلئے نہیں چھوڑا بلکہ اپنے اہداف ومقاصد کی خود وضاحت فرمائی۔ ہم ان نقوش کو امامؑ کے فرمودات وکلمات کے روشنی میں مختصراً پیش کررہے ہیں۔

۱۔ دین خدا کا احیاء:

تحریک کربلا جس میں اصحاب و احباب، بچوں، بیٹوں، عزیز و اقارب کی قربانی اور تطہیر کی پروردہ مخدرات عصمت وطہارت کی اسارت کوئی معمولی واقعہ نہیں اور یہ عظیم قربانیاں کسی عام مقصد کیلئے نہ تھیں، بلکہ اپنا سب کچھ، جان و مال قربان کرنے اور ہر قسم کی مصیبت کو برداشت کرنے کا مقصد دین الٰہی کا احیاء اور اسلام کو بدعتوں سے نجات دینا تھا، تا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلمہ سربلند رہے جیسا کہ ارشاد پروردگار ہے:

﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾

اور کلمۃ اللہ ہی ہمیشہ سربلند ہے۔[1]

جب دین خدا کو خطرہ ہو اور جہاں ظلم و بربریت، شرک و کفر اور بدعت گری کا رواج ہونے لگے تو بندہ الٰہی کا فریضہ بنتا ہے کہ وہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دے اور ظالموں اور مستکبروں کے ہاتھ پر ہاتھ نہ رکھے۔ حضرت امیر المومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَاِذَا نَزَلَتْ نَازِلَةٌ فَاجْعَلُوْا اَنْفُسَكُمْ دُوْنَ دِيْنِكُمْ۔

جب تمہارے دین پر مسئلہ بن جائے تو دین پر جان قربان کر دینا دین پر آنچ نہ آنے دینا۔[2]

امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا:

> اسلام اتنا عزیز اور سربلند ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد نے اسلام پر اپنی جانوں کو نثار کر دیا۔ حضرت سیّد الشہداء علیہ السلام نے اپنے عظیم جوانوں کے ساتھ اپنی جانیں قربان کر دیں اور اسلام کو زندہ کیا۔[3]

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بنی امیہ کے زمانے میں دین پر کیا کیا ستم ڈھائے گئے۔ نبی مکرمؐ کی تعلیمات اور قانون الٰہی کو کتنا تاراج کیا گیا۔ اسلامی اقدار کو مٹانے کیلئے کیا کیا حربے استعمال کئے گئے۔

---

[1] سورۂ توبہ، آیت ۴۰۔

[2] الکافی، ج ۲، ص ۲۱۶۔

[3] صحیفہ امام، ج ۸، ص ۱۵۱۔

کس قدر بدعتوں اور فسق و فجور کو رائج کیا گیا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام مقدس کو مٹانے کیلئے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ مومنین اور اہل بیت علیہم السلام کے ماننے والوں پر کیا کیا مظالم کے پہاڑ گرائے گئے۔

کتنا بڑا لمحہ فکریہ ہے کہ حضور اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ بند ہوئے ابھی پچاس سال بھی نہ گزرے تھے کہ اتنا بڑا دردناک واقعہ ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسہ کو تین دن کا تشنہ دہاں ذبح کر دیا گیا اور آنحضرتؐ کی بہو بیٹیوں کو بے مقنع و چادر بازار و دربار میں لایا گیا۔ آخر مسلمانوں کی غیرت کہاں گئی۔ یہ راتوں رات کا تو مسئلہ نہیں بلکہ اس کی تاریخ بہت پیچھے جاتی ہے جس کے بیان کی یہاں مجال نہیں ہے۔[1]

بہرکیف جب یزید جیسا فاسق و فاجر مسند خلافت پر قابض ہوا تو امام مظلومؑ نے ارشاد فرمایا:

وَ عَلَى الْاِسْلَامِ السَّلَامُ اِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْاُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلِ يَزِيْدَ۔

اگر یزید جیسا اسلام پر قابض ہو جائے تو اسلام کا فاتحہ پڑھ لو۔[2]

پس امام حسین علیہ السلام نے اپنی لازوال قربانی کے ذریعے دین الٰہی کا احیاء کیا۔

دیتے نہ سر حسینؑ تو پڑھتا نماز کون؟

اس وقت اسلام کی جتنی اقدار اور جتنے آثار موجود ہیں وہ سب حضرت امام حسین علیہ السلام کے قیام اور قربانیوں کا صدقہ ہیں۔

۲۔ سنت رسولؐ کا احیاء:

امام حسین علیہ السلام نے اہل بصرہ کو خط لکھ کر حجت تمام کی، تاکہ کل کوئی یہ نہ کہے کہ ہمیں تو خبر ہی نہ تھی۔ آپؑ نے واضح طور پر یزیدی حکومت کے خلاف قیام کیا۔ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

اِنِّيْ اَدْعُوْكُمْ اِلَى اللّٰهِ وَ اِلَى نَبِيِّهٖ فَاِنَّ السُّنَّةَ قَدْ اُمِيْتَتْ فَاِنْ تُجِيْبُوْا دَعْوَتِيْ

---

[1] اس سلسلے تفصیل کیلئے رجوع فرمائیں: تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۹۸۔ الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۲۰۔ عقد الفرید، ج ۳، ص ۱۷۶۔ کنز العمال، ج ۳، ص ۱۳۹۔ مروج الذہب، ج ۲، ص ۱۵۹۔

[2] مقتل لہوف، ص ۹۹۔ بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۳۲۶۔

وَ تُطِيْعُوْا اَمْرِیْ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ۔

میں تمہیں خدا اور سنت پیغمبرؐ کی دعوت دیتا ہوں۔ (دیکھ رہے ہو حالات کیا بن گئے ہیں) کہ اس گروہ نے سنت پیغمبر کو برباد کر دیا ہے، بدعتوں نے سر نکال لیا ہے اور بدعتیں زندہ ہوگئی ہیں۔ اگر تم میری بات سنو گے اور میرے امر کی اطاعت کرو گے تو میں تمہیں صحیح راستے کی ہدایت کروں گا۔[1]

امام علیہ السلام نے واضح بتا دیا کہ اگر ہماری اطاعت و اتباع نہیں کرو گے تو نہ تمہیں ہدایت ملے گی اور نہ تمہیں صراط مستقیم مل پائے گا۔

۳۔ ظالم حکمرانوں کے خلاف احتجاج

امام حسین علیہ السلام کربلا کی طرف رواں دواں تھے کہ راستے میں فرزدق سے ملاقات ہوئی تو امام علیہ السلام نے حاکم شام کی بدعتوں کا تذکرہ کیا اور ظالم حکمرانوں کے خلاف احتجاج اور اپنے قیام کے متعلق بتایا:

يَا فَرَزْدَقُ! اِنَّ هٰؤُلَآءِ قَوْمٌ لَزِمُوْا طَاعَةَ الشَّيْطٰنِ وَ تَرَكُوْا طَاعَةَ الرَّحْمٰنِ وَ اَظْهَرُوا الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ وَ اَبْطَلُوا الْحُدُوْدَ وَ شَرِبُوا الْخُمُوْرَ وَ اسْتَاْثَرُوْا فِیْ اَمْوَالِ الْفُقَرَآءِ وَ الْمَسَاكِيْنِ وَ اَنَا اَوْلٰی مَنْ قَامَ بِنُصْرَةِ دِيْنِ اللّٰهِ وَ اِعْزَازِ شَرْعِهٖ وَ الْجِهَادِ فِیْ سَبِيْلِهٖ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْيَا۔

اے فرزدق! اس یزیدی ٹولہ نے شیطان کی غلامی کو اپنا لیا ہے اور انہوں نے اللہ کی اطاعت کو چھوڑ دیا ہے، زمین پر کھلم کھلا فساد کر رہے ہیں، حدود الٰہیہ کو باطل اور تعطیل کر دیا ہے۔ (یزیدی حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے ہیں)، شراب خور ہیں، قومی ذخیروں پر قبضہ کئے ہوئے ہیں، فقراء و مساکین کے اموال کو ہڑپ کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں میری ذمہ داری سب سے زیادہ ہے کہ میں دین خدا کی نصرت کیلئے قیام کروں اور راہ خدا میں جہاد کروں تا کہ کلمۂ الٰہی کی سربلندی و سرفرازی ہو۔[2]

---

[1] تاریخ طبری، ج ۴، ص ۲۶۶۔ بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۳۴۰۔

[2] تذکرۃ الخواص، ص ۲۱۷۔ ۲۱۸۔

۴۔احقاقِ حق اور ابطالِ باطل:

امام حسین علیہ السلام نے حق کو زندہ کرنے اور باطل کو مٹانے کیلئے قیام کیا۔اسی طرح امام علیہ السلام نے کربلا کے سفر کے دوران ارشاد فرمایا:

اَلَا تَرَوْنَ اَنَّ الْحَقَّ لَا یُعْمَلُ بِهٖ. وَ اَنَّ الْبَاطِلَ لَا یُنْتَهٰی عَنْهُ. لِیَرْغَبِ الْمُؤْمِنُ فِیْ لِقَآءِ اللّٰهِ مُحِقًّا. فَاِنِّیْ لَا اَرَی الْمَوْتَ اِلَّا سَعَادَةً. وَ لَا الْحَیَاةَ مَعَ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا بَرَمًا۔

کیا آپ نہیں دیکھ رہے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور باطل سے کنارہ کشی نہیں کی جارہی ہے۔ایسے حالات میں مومن کی ذمہ داری بنتی ہے کہ لقائے پروردگار کیلئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے۔ایسے حالات میں، میں موت کو سعادت سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندہ رہنے کو ننگ و عار جانتا ہوں۔[1]

حضرت امام حسین علیہ السلام نے حق کی سربلندی اور باطل کی نابودی کیلئے قیام کیا۔آپؑ کا قیام اعتلائے کلمۂ حق، بقائے اسلام اور احیاء دین کیلئے تھا تاکہ بنی امیہ کی اصلیت کو بے نقاب کریں اور جابروں اور مستکبروں کے چنگل سے بشریت کو آزاد کرائیں اور انہیں حرمت و آزادی نصیب کریں۔ جیسا کہ زیارت اربعین میں نقل ہوا ہے:

وَ بَذَلَ مُهْجَتَهٗ فِیْكَ لِیَسْتَنْقِذَ عِبَادَكَ مِنَ الضَّلَالَةِ وَ حَیْرَةِ الْجَهَالَةِ۔

امام حسینؑ نے اپنے مقدس خون کو قربان کیا تاکہ بندگان الٰہی کو جہالت و گمراہی کی حیرت سے نجات دلائیں۔[2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ امام علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ کے بعد جب ابراہیم بن طلحہ بن عبید اللہ نے حضرت امام سجاد علیہ السلام سے پوچھا: فرزند رسولؐ! کون کامیاب ہوا؟ تو امامؑ نے فرمایا:

---

[1] تاریخ طبری، ج ۴، ص ۳۰۵۔

[2] مفاتیح الجنان، زیارت اربعین۔

اِذَا اَرَدْتَ اَنْ تَعْلَمَ مَنْ غَلَبَ وَ دَخَلَ وَقْتُ الصَّلٰوۃِ فَاَذِّنْ ثُمَّ اَقِمْ۔

اگر تم یہ معلوم کرنا چاہو کہ کس نے فتح حاصل کی ہے تو نماز کے وقت اذان اور اقامہ کہو (تو واضح ہو جائے گا کہ کس کی کامیابی ہوئی ہے)۔[1]

۵۔امر بالمعروف ونہی عن المنکر

حضرت امام حسین علیہ السلام کے قیام کا ایک اور مقصد نیکیوں کو پھیلانا اور برائیوں کو مٹانا تھا۔امام علیہ السلام کی تحریک میں ایک بنیادی اور اہم نکتہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ برائیوں سے نہ روکنے کا نتیجہ ہلاکت ہوا کرتا ہے۔ارشاد پروردگار ہے:

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ﴾

تو تمہارے پہلے والے زمانوں اور نسلوں میں ایسے صاحبان عقل کیوں نہیں پیدا ہوئے ہیں جو لوگوں کو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے ،علاوہ ان چند افراد کے جنہیں ہم نے نجات دے دی اور ظالم تو اپنی عیش ہی کے پیچھے پڑے رہے اور یہ سب کے سب مجرم تھے۔[2]

اور پھر دوسری آیہ شریفہ میں بہترین امت کا دارو مدار امر بالمعروف و نہی عن المنکر قرار دیا ہے۔ خیر امت کا منصب دعوت الی الخیر سے میسر ہوتا ہے۔ارشاد فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی خیر وصلاح کیلئے پیدا کئے گئے ہو، (کیونکہ) تم

---

[1] بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۷۷۔

[2] سورۂ ھود، آیت ۱۱۶۔

نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔[1]

آپ نے توجہ فرمائی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایمان باللہ پر مقدم قرار دیا گیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس فریضہ کے بغیر ایمان میں بھی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں: ایمان باللہ اسی فریضہ سے استوار ہوتا ہے اور معاشرہ کے تمام امور کی خیر و صلاح بھی اس فریضہ کے ساتھ وابستہ ہے۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

قِوَامُ الشَّرِيْعَةِ الْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اِقَامَةُ الْحُدُوْدِ۔

شریعت کی بنیادیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے استوار اور حدود الٰہی کا قیام اسی فریضہ سے قائم ہوتا ہے۔[2]

حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے انقلاب و قیام کی بنیادوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر استوار کیا۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنِّیْ لَمْ اَخْرُجْ اَشِرًا وَّ لَا بَطِرًا وَّ لَا مُفْسِدًا وَّ لَا ظَالِمًا وَّ اِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِیْ اُمَّةِ جَدِّیْ (ص)، اُرِیْدُ اَنْ اٰمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَنْهٰی عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اَسِیْرَ بِسِیْرَةِ جَدِّیْ وَ اَبِیْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ (ع)۔

میں (مدینہ سے) کسی فساد پھیلانے، ظلم و جبر اور شر کیلئے نہیں نکل رہا ہوں، بلکہ میرا مقصد اپنے جد نامدار کی امت کی اصلاح ہے۔ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کروں گا۔ میں اپنے جد بزرگوار اور پدر نامدار علی بن ابی طالب کی سیرت پیش کروں گا۔[3]

یہی وجہ ہے کہ ہم آپؑ کی زیارت مقدسہ میں اپنی عقیدت کا یوں اظہار کرتے ہیں:

اَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ اَقَمْتَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَیْتَ الزَّكٰوةَ وَ اَمَرْتَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ

---

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۱۱۰۔

[2] غرر الحکم، حکمت نمبر ۶۸۱۷۔

[3] بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۳۲۹۔۳۳۰۔

نَهَيْتَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

میں گواہی دیتا ہوں آپؑ نے نماز کو قائم اور زکوٰۃ کو ادا کیا، آپؑ نے نیکیوں کا حکم دیا اور برائیوں سے روکا۔[1]

زائر حسینی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ: اے سیّد الشہداء! آپؑ کا انقلاب امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اصلاح امت کیلئے تھا۔ آپؑ نے للّٰہیت کی وہ بنیادیں رکھیں جو تا قیام قیامت باقی و برقرار رہیں گی۔ آپؑ کا قیام ایک ابدی تحریک کا پیش خیمہ ہے جس میں زندگی کا مکمل لائحہ عمل ہے۔ آپؑ نے باب شہادت میں تمام دینی تعلیمات کا خزانہ نصیب کیا جس میں عقل وفکر، شجاعت وعزت، مہر ومحبت کا حسین امتزاج ہے۔ آپؑ نے دین کی بقاء کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور ہم آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کر کے عہد کرتے ہیں کہ ہم تا قیامت اس درس کو یاد رکھیں گے، آپؑ کی صدائے استغاثہ ہمارے ضمیر و وجدان پر منقش ہے، ہم کسی یزیدی کے سامنے سر خم نہیں کریں گے، ''ہیہات منا الذلہ''، ہم نے اس شجاعت وغیرت کو آپؑ کے وجود مقدس سے حاصل کیا ہے، عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے، عزت ووقار کی زندگی، زندگی کہلانے کی حقدار ہوا کرتی ہے۔ آپؑ نے شہادت کے سائے میں مہر ومحبت سکھائی کہ ہم آپؑ پر گریہ وبکا اور عزاداری کو عبادت سمجھتے ہیں۔

امام مظلومؑ کے مصائب پر گریہ وزاری بیداری کا باعث بنتی ہے۔ اس وقت غزہ فلسطین، عراق، افغانستان، بحرین، مصر، لبنان، پاکستان ۔۔۔ کی سرزمینوں پر صیہونیوں اور تکفیری یزیدیوں کے ہاتھوں ظلم کے پہاڑ گرائے جا رہے ہیں جو کربلائے حسینی کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ ان حالات میں حسینیوں کی زیادہ ذمہ داری بنتی ہے۔ ہم نے اپنے مولا وآقا کی آواز کو لوگوں کے کانوں تک نہیں بلکہ دلوں تک پہنچانا ہے اور اسی کو مبلغ حسینی کہا جائے گا جو اپنی مجالس میں سیّد الشہداءؑ کے ان بلند مقاصد کو دنیا کے سامنے پیش کریں جن کی خاطر یہ عظیم قربانیاں دی گئیں۔

*****

[1] مفاتیح الجنان، زیارت وارث۔

کربلا میں جوانوں کا عزم

حجۃ الاسلام مولانا سیّد شمشاد حسین رضوی
(ناروے)

مغربی دنیا، یورپ، امریکہ اور کینڈا اور مشرق وسطی کا آج کا بھٹکتا، غافل و جاہل جوان، غلط اور جھوٹے پروپیگنڈوں، برین واش (ذہن شوری) کی وجہ سے، طالبان و القاعدہ اور خاص طور سے تکفیریوں یا ''داعش'' جیسے گمراہ و غافل اور بدنام زمانہ گھٹیا و نیچ گروہ کے ہاتھوں، بڑی تیزی کے ساتھ چڑھتا جارہا ہے۔

ضرورت ہے کہ مثالی کرداروں اور آئیڈیل و بہترین نمونوں کو پیش کیا جائے تا کہ وہ اس سن وسال کی اہمیت وعظمت کو سمجھیں اور اس کا صحیح فائدہ اٹھائیں۔ اس لئے کہ ''شباب اور عافیت'' ان دونوں کی اہمیت وفوائد کی قدر ومنزلت کو اس کو کھو دینے والا ہی پہچانتا ہے اور کوئی دوسرا نہیں۔

جوانی وہ دَور ہے جب انسان کا ادراک کامل ہوجاتا ہے اور اس کی طاقت کام کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم انسانیت میں جملہ اہم کام جوانوں ہی سے لئے جاتے ہیں اور انہی کو سنگین کاموں کا اہل سمجھا جاتا ہے[1]۔ عمر کا یہ دورانیہ کئی اعتبار سے امتحانات وآزمائشات کے مراحل سے گزرتا ہے، لیکن جو بھی اس صبر آزما اوقات کو دلجمعی سے کاٹ لیتا ہے تو پھر کمالات کے اعلیٰ درجہ پر ہی فائز ہوتا ہے اور خالق سے لیکر مخلوق تک اور ساری دنیا میں اسی کا نام ہوتا ہے۔ اسی لئے جناب جبرئیلؑ نے جنگ

---

[1] ذکر وفکر، علامہ ذیشان جوادی۔

اُحد میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی شجاعتوں ہی کا ڈنکا اس لہجہ میں بجایا:

لَا سَیْفَ اِلَّا ذُو الْفَقَارِ وَ لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ۔

ذوالفقار جیسی کوئی دوسری تلوار نہیں اور علیؑ کے علاوہ کوئی جوان نہیں۔[1]

قرآن کریم میں جوانوں کا تذکرہ

قرآن مجید میں جوانوں کا تذکرہ مختلف آیات وسوروں میں ہوا ہے:

خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًی یَّذْکُرُهُمْ یُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِیْمُ ﴿۶۰﴾﴾

لوگوں نے بتایا کہ ایک جوان ہے جو ان کا ذکر کیا کرتا ہے اور اسے ابراہیمؑ کہا جاتا ہے۔[2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سفر کرنے والے جوان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾﴾

اور اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنے جوان سے کہا کہ میں چلنے سے باز نہ آؤں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں یا یوں ہی برسوں چلتا رہوں۔[3]

سورۂ یوسف میں ارشاد ہوا:

﴿وَ قَالَ لِفِتْیٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤی اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾

اور یوسفؑ نے اپنے جوانوں سے کہا کہ ان کی پونجی بھی ان کے سامان میں رکھ دو شاید جب گھر پلٹ کر جائیں تو اسے پہچان لیں اور اس طرح شاید دوبارہ پلٹ کر ضرور آئیں۔[4]

---

[1] الکافی، ج ۸، ص ۱۱۰۔

[2] سورۂ انبیاء، آیت ۶۰۔

[3] سورۂ کہف، آیت ۶۰۔

[4] سورۂ یوسف، آیت ۶۲۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے زندان کے دو جوان ساتھیوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۖ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

اور قید خانہ میں ان کے ساتھ دو جوان اور داخل ہوئے ایک نے کہا کہ میں نے خواب میں اپنے کو شراب نچوڑتے دیکھا ہے اور دوسرے نے کہا میں نے دیکھا ہے کہ میں اپنے سر پر روٹیاں لادے ہوں اور پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں۔ ذرا اس کی تاویل تو بتاؤ کہ ہماری نظر میں تم نیک کردار معلوم ہوتے ہو۔[1]

اصحاب کہف کے بارے میں آواز قدرت آئی:

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝﴾

ہم آپ کو ان کے واقعات بالکل سچے سچے بتا رہے ہیں۔ یہ چند جوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا تھا اور ان کے دلوں کو مطمئن کر دیا تھا اس وقت جب یہ سب یہ کہہ کر اٹھے کہ ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا مالک ہے ہم اس کے علاوہ کسی خدا کو نہ پکاریں گے کہ اس طرح ہم بے عقلی کی بات کے قائل ہو جائیں گے۔[2]

جوان خواتین کا تذکرہ سورۂ نساء میں ان الفاظ میں ہوا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ﴾

---

[1] سورۂ یوسف، آیت ۳۶۔

[2] سورۂ کہف، آیت ۱۳۔ ۱۴۔

اور جس کے پاس اس قدر مالی وسعت نہیں ہے کہ مومن آزاد عورتوں سے نکاح کرے تو وہ مومنہ کنیز عورت سے عقد کر لے۔[1]

سورۂ نور کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾

اور خبردار اپنی کنیزوں کو اگر وہ پاکدامنی کی خواہشمند ہیں تو بدکاری پر مجبور نہ کرنا کہ ان سے زندگانی دنیا کا فائدہ حاصل کرنا چاہو۔[2]

کربلا کے جوان

کربلا کے جوانوں کو صرف اُن واقعات کے تناظر میں نہ دیکھا جائے جو کسی عالم، خطیب، ذاکر، شاعر و مداح یا کسی اہل قلم کے بیان کردہ موضوعات تک محدود ہوں، بلکہ اُن کی ہر نشست و برخاست اور گفتگو، رزمیہ کلام و شاعری اور ہر وہ اقدام جو نصرتِ مولا امام حسین علیہ السلام میں اٹھایا گیا ہے اس کی تجزیاتی و تحلیلی شناسائی ہونی ضروری ہے، تاکہ خود اپنا جوان کہیں ان شیاطین کے مکر و فریب کے جال میں نہ پھنس جائے یا غفلت سے ارتکابِ معصیت کا شکار ہو جائے۔ الیکٹرانک دنیا نے معلومات و اطلاعات کا ایک جنگل فراہم کر دیا ہے جہاں بیش بہا راستوں میں بھول بھلیوں کی طرح اس میں گم ہو جانا یقینی ہوا جا رہا ہے۔ منٹوں اور سیکنڈوں میں دنیا میں اخبار و سماچار میں اتھل پتھل ہو جاتی ہے۔

کس کس کو روئیں اور کہاں کہاں روئیں؟ تھوڑی سی فکر کی دنیا اور جتنا اپنا امکان ہے، باتوں کو پہنچانا، ہر صاحب زبان و قلم کا کام ہے۔ یہ فریضہ اس علم کی بنیاد پر ہے جو رب العالمین نے اسے عطا کیا ہے۔ تحریکِ کربلا یا انقلاب حسینیؑ کو صرف عامیانہ نظر سے نہ دیکھا جائے۔ واضح کیا جائے کہ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب و انصار اور خانوادہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس میں عقلی و شرعی

---

[1] سورۂ نساء، آیت ۲۵۔

[2] سورۂ نور، آیت ۳۳۔

اعتبار سے نفع ہی نفع ہے۔ مشاہدہ کے طور سے دیکھئے کہ شہزادہ حضرت علی اکبر علیہ السلام کا اپنے بابا حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ کیا مکالمہ ہوا تھا:

يَا اَبَتِ لَآ اَرَاكَ اللهُ سُوْٓءًا اَلَسْنَا عَلَى الْحَقِّ؟ قَالَ بَلٰى وَ الَّذِىْ اِلَيْهِ مَرْجِعُ الْعِبَادِ! قَالَ: فَاِنَّنَا اِذًا لَّا نُبَالِىْ اَنْ نَّمُوْتَ مُحِقِّيْنَ. فَقَالَ لَهُ الْحُسَيْنُ (ع):

جَزَاكَ اللهُ مِنْ وَّلَدٍ خَيْرَ مَا جَزٰى وَلَدًا عَنْ وَّالِدِهٖ۔

بابا! اللہ آپ کو ہر بلا سے محفوظ رکھے! کیا ہم لوگ حق پر نہیں ہیں؟ بیٹا! مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کی طرف تمام مخلوق رجوع کرتی ہے! یقیناً ہم لوگ حق پر ہیں۔ اس پر شہزادے نے عرض کی: تو پھر بابا! حق پر ہوتے ہوئے ہمیں موت کی کیا پرواہ ہے۔ یہ سن کر امام مظلومؑ نے فرمایا: بیٹا اللہ تمہیں اپنے باپ کی جانب سے بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔[1]

مدینہ منورہ سے چلتے وقت حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے سیاسی و الٰہی وصیت نامہ میں فرمایا تھا:

وَ اِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِىْٓ اُمَّةِ جَدِّىْ (ص) اُرِيْدُ اَنْ اٰمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اَسِيْرَ بِسِيْرَةِ جَدِّىْ وَ اَبِىْ عَلِىِّ بْنِ اَبِىْ طَالِبٍ (ع). فَمَنْ قَبِلَنِىْ بِقَبُوْلِ الْحَقِّ فَاللهُ اَوْلٰى بِالْحَقِّ وَ مَنْ رَدَّ عَلَىَّ هٰذَا اَصْبِرُ حَتّٰى يَقْضِىَ اللهُ بَيْنِىْ وَ بَيْنَ الْقَوْمِ بِالْحَقِّ وَ هُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِيْنَ۔

میں اپنے جد کی امت کی اصلاح کیلئے قیام کر رہا ہوں، تاکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو رائج کر سکوں اور اپنے جد اور والد کے قانون پر عمل کروں جس نے بھی اس حقیقت کو سمجھا اس نے راہِ خدا کو اختیار کیا اور جس نے میری بات نہ مانی میں اپنے صبر و استقامت کے راستے پر چلتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ خداوند عالم میرے اور اس قوم کے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے ہے۔[2]

---

[1] الارشاد، شیخ مفیدؒ، ج ۲، ص ۸۲۔

[2] بحار الانوار، ج ۴۴، ص ۳۳۰۔ مقتل خوارزمی ج ۱، ص ۱۸۸۔

کربلا کے جوانوں کی طولانی فہرست ہے۔ ویسے تو فرمان رسولؐ کی روشنی میں سب کے سب جوان تھے۔ اس لئے کہ جنت میں کوئی بھی بوڑھا نہیں جائے گا اور شہدائے کربلا جنت کیا وہ تو جنت کیلئے شفاعت وسفارش کرنے والے لوگ ہیں، مگر ظاہری لحاظ سے ۱۳ و ۱۸ سال کی عمر سے ۴۰ و ۵۰ سال کے شہداء میں سب کی اعلیٰ ہمت وحوصلوں کی باتوں اور کمالات وشجاعتوں کے ذکر کی اس مختصر تحریر میں کہاں گنجائش ہے کہ سب کو سمیٹا جا سکے۔

اگر کربلا کے جوانوں اور اصحاب کے عزم بالجزم کی داستانیں ثبت وضبط نہ ہوتیں تو حسینی انقلاب، کربلا کی زمین میں دفن ہو کر رہ جاتا۔ انسان حیران ہے کہ اللہ نے انہیں کس طرح ہمت وحوصلہ دیا تھا۔ کہاں ہزاروں افراد کا آمادہ وکھایا پیا لشکر اور ادھر بھوکے پیاسے اور اسلحے کے ساز وسامان سے بغیر مجاہدین!! واقعی بس خاصانِ خدا کی بات ہی اور ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی جان کی حفاظت ہر صحابی اپنا دینی وشرعی فریضہ سمجھتا تھا۔ ان کا یقین تھا کہ مولاؑ کی حفاظت سے دین کی ہی بقا ہے۔ روزِ عاشور جس وقت عمر بن سعد کا پیغام لیکر کثیر بن عبداللہ آتا ہے، اسی وقت فوراً ابوثمامہ صائدی اس کی طرف بڑھ کر کہتے ہیں: ''اپنی شمشیر رکھ دے پھر پیغام دے''۔ اس نے کہا میں اس کا بھیجا ہوا پیغام رساں ہوں اور میں یہ نہیں کر سکتا۔ ابوثمامہ نے یہ بات اس لئے کہی تھی اُس وقت امامؑ کے قتل کا بھی احتمال تھا۔ پھر ابوثمامہ نے کہا: میں تمہاری شمشیر کے دستے کو اپنے ہاتھ میں پکڑوں گا تب تو پیغام دے سکتا ہے۔ اس نے پھر کہا: میری شمشیر کو تو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اس پر ابوثمامہ صائدی نے حضرت امام حسینؑ سے ملنے کی اجازت ہرگز نہ دی۔

واقعۂ کربلا کے پہلے شہید حضرت مسلم بن عقیلؑ ہیں جنہیں آخری لمحات میں اپنی موت کا یقین تھا کہ اب درجۂ شہادت پر فائز ہونا ہے مگر انہیں اپنے جان کی فکر ہرگز نہ تھی بلکہ اپنے مولاؑ کی فکر کہ ان تک یہ بات پہنچ جائے کہ اب وہ کوفہ نہ آئیں، کیونکہ خطراتِ شہادت زیادہ ہیں۔ اسی لئے ابن زیاد سے جناب مسلم بن عقیلؑ نے وصیت کی تھی کہ امامؑ کو یہ بات لکھ دی جائے۔

امام علیہ السلام جب ظہر عاشور کو نمازِ خوف پڑھنے کیلئے کھڑے ہوئے تو سعید بن عبداللہ نے امامؑ کے پاس

کھڑے ہوکر اپنے سینوں پر تیر لئے تا کہ امامؑ نماز ادا کر سکیں اور جب تیر کھا کر گرے تو امامؑ سے پوچھا:
''فرزندِ رسولؐ! کیا میں نے حق وفا ادا کیا؟!

دوسرا منظر اس وقت کا ہے جب سیف ابن حارث بن سریع اور مالک بن عبد بن سریع دونو جوان روتے ہوئے امامؑ کی خدمت میں آتے ہیں تو امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

يَا ابْنَيْ اَخِيْ! مَا يُبْكِيكُمَا فَوَ اللهِ اِنِّيْ لَاَرْجُوْ اَنْ تَكُوْنَا بَعْدَ سَاعَةٍ قَرِيْرَيِ الْعَيْنِ. فَقَالَا: جَعَلَنَا اللهُ فِدَاكَ وَ اللهِ! مَا عَلَى اَنْفُسِنَا نَبْكِيْ وَ لٰكِنْ نَّبْكِي عَلَيْكَ. نَرَاكَ قَدْ اُحِيْطَ بِكَ وَ لَا نَقْدِرُ عَلَى اَنْ نَّنْفَعَكَ. فَقَالَ: جَزَاكُمَا اللهُ يَا ابْنَيْ اَخِيْ! بِوُجْدِكُمَا مِنْ ذٰلِكَ وَ مُوَاسَاتِكُمَا اِيَّايَ بِاَنْفُسِكُمَا اَحْسَنَ جَزَآءِ الْمُتَّقِيْنَ۔

اے ہمارے بھائی کے بیٹو! کیوں رو رہے ہو؟ خدا کی قسم! مجھے امید ہے تم ابھی کچھ دیر بعد میری آنکھوں کی ٹھنڈک بننے والے ہو۔ انہوں نے عرض کی: مولا! ہم اپنی حالت پر نہیں بلکہ آپؑ کی خاطر رو رہے ہیں۔ ہم دیکھ رہے کہ آپؑ کو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے اور ہم آپؑ کیلئے کچھ نہیں کر پا رہے۔ یہ سن کر امامؑ نے انہیں دُعا دیتے ہوئے کہا: اللہ تم دونوں کو اس احساس اور تعاون پر اپنے بہترین متقی بندوں کی جزا عنایت فرمائے۔[1]

مقتل کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس کے بعد دونوں نے امام علیہ السلام کو آخری سلام کیا اور جنگ کیلئے روانہ ہوئے اور بہت سے یزیدیوں کو فی النار کر کے شہید ہو گئے۔

یہ اصحابِ حسینؑ تھے جن کے بارے میں خود امام علیہ السلام نے فرمایا تھا:

اِنِّيْ لَا اَعْلَمُ اَصْحَابًا اَوْلٰى وَ لَا خَيْرًا مِنْ اَصْحَابِيْ وَلَا اَهْلَبَيْتٍ اَبَرَّ وَ لَا اَوْصَلَ مِنْ اَهْلِبَيْتِيْ. فَجَزَاكُمُ اللهُ عَنِّيْ جَمِيْعًا خَيْرًا۔

میرے اصحاب سے بڑھ کر اور بہتر کوئی اصحاب نہیں ہیں اور میرے اہل بیت سے

---

[1] وقعۃ الطف، ص ۲۳۴۔۲۳۵۔

نیکوکار تر اور جانثار کوئی کسی گھر والے نہیں ہیں۔ اللہ میری جانب سے ان سب کو
جزائے خیر عنایت فرمائے۔[1]

کیا اس وقت کو بھلایا جا سکتا ہے جب شمر ذی الجوشن، نو محرم کو دوپہر کے بعد امامؑ کے خیموں کے پاس آ کر حضرت عباسؑ اور ان کے بھائیوں کو آواز دیتا ہے: ''اَیْنَ بَنُوْ اُخْتِنَا'': میرے بھانجو! تم سب کہاں ہو؟ اس کے جواب میں حضرت عباسؑ اور ان کے بھائیوں نے آ کر پوچھا: ہم سب سے تو کیا چاہتا ہے؟ اس نے کہا: میں عبید اللہ کی طرف سے تمہارے لئے امان نامہ لایا ہوں اور اب ایسے موقع سے فائدہ اٹھالو۔ سب نے کہا: 'تمہارے امان نامہ پر خدا کی لعنت ہو، یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم امان لے لیں اور زہراؑ و علیؑ کے فرزند امان میں نہ رہیں''۔[2]

اسی طرح وہ وقت جب امام مظلوم علیہ السلام نے شب عاشورہ اپنے تمام اصحاب کو جمع کر کے فرمایا:
میں تم لوگوں سے اپنی بیعت اٹھائے لے رہا ہوں۔ جس کو جانا ہے رات کی تاریکی
میں چلا جائے۔

تو سرزمینِ کربلا سے نہ ہی کوئی امام حسین علیہ السلام گیا بلکہ اسی انداز میں سب نے کہا تھا کہ مولاؑ ہم آپ کو چھوڑ کر کیوں جائیں۔ حضرت عباسؑ نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے عرض کی:
کس لئے آپؑ کو تنہا چھوڑیں۔ کیا آپؑ کے بعد زندہ رہنا ہمیں گوارا ہے۔ خدا وہ
دن نہ لائے کہ آپؑ شہید ہو جائیں اور ہم زندہ رہیں۔!!!

فرزندانِ عقیلؑ نے کہا:
مولا! ہم سب کی جان و مال اور خاندان آپؑ پر قربان! ہم آپؑ کو ہرگز تنہا نہ
چھوڑیں گے۔

اسی لمحہ مسلم ابن عوسجہ آگئے اور کہا:

---

[1] وقعۃ الطف، ص ۱۹۷۔

[2] تاریخ طبری، ج ۲، ص ۲۱۵۔

کیا ایسے وقت میں آپؑ کو تنہا چھوڑ دیں جب دشمن نے چاروں طرف سے آپ کا
محاصرہ کرلیا ہے۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ آپؑ کو ہم چھوڑیں۔ اگر ہمارے پاس کوئی
اسلحہ اور تلوار بھی نہ ہوئی تو پتھروں سے مار مار کر جنگ کریں گے۔

اس کے بعد سعید ابن عبداللہ حنفی کھڑے ہو گئے اور کہا:

خدا کی قسم اگر آپؑ کی راہ میں مارا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر جلا دیا جاؤں
اور خاکستر کر دیا جاؤں اور اس طرح ستر (۷۰) بار کیا جاؤں تب بھی آپؑ سے
ہرگز جُدا نہ ہوں گا۔

یہ جذبہ ہر صحابی میں تھا اور ہر جوان سربکف تھا۔ اصحابِ امامؑ اور کربلا کے جوانوں کا ایمان اتنا قوی تھا کہ ان کے پائے استقامت و استقلال میں لغزش آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اُس وقت دنیا کے حالات ایسا رُخ اختیار کر چکے تھے کہ سب کے سب خاموش تھے۔ اُس وقت کا بڑے سے بڑا صحابیٔ رسول یزید کے مقابلے بولنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ کوئی اسلام و حق کی حمایت کرنے والا نہ تھا۔

صبحِ عاشور امام علیہ السلام نے اپنے دوستوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ جنگ کا آغاز ہم نہیں کریں گے۔ امامؑ کا یہ جملہ آج تک دنیا کو پیغام دے رہا ہے کہ دہشت گردی اور ڈرانا و دھمکانا اسلامی شعار نہیں! اپنے بڑے بیٹے حضرت علی اکبر علیہ السلام سے اذان صبح دلوا کر اِتمام حجت بھی کیا اور اکثر تاریخی کتب میں ہے کہ بنی ہاشم میں سب سے پہلے شہید یہی ہیں جن کیلئے حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا تھا:

خدایا! اس قوم کے مظالم پر تو گواہ رہنا کہ اب میں میدان جنگ میں اس کو بھیج رہا
ہوں جو اخلاق و کردار میں تیرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ تھا۔

شہزادہ حضرت قاسم علیہ السلام سے جب موت کے بارے میں مولاؑ نے پوچھا تھا کہ موت کو کیسا پاتے ہو تو جواب میں کہا تھا: ''شہد سے زیادہ شیریں''۔ کربلا کا ہر جوان خود اپنی نظیر تھا جو نہ موت سے خائف تھا اور نہ ہی ان کیلئے امام حسین علیہ السلام سے زیادہ کوئی چیز عزیز تھی۔ عبداللہ بن وہب جن کی شادی ابھی تازہ ہوئی مگر کربلا میں اپنی والدہ اور زوجہ کے ساتھ پہنچ کر ہمرکابِ امامؑ ہو کر جامِ شہادت نوش کیا۔

جون غلام نے کس انداز میں مرنے کی اجازت لی تھی وہ جملے نا قابلِ بیان ہیں کہ امامؑ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ میدان میں جائیں اور شہید ہوں:

مولا! میں سیاہ فام ہوں۔ میرے جسم سے بو آتی ہے۔ مجھے اجازت کہاں مل سکتی ہے کہ ان شہیدوں کے ساتھ میرا خون مل سکے۔

اور پھر امامؑ کی اجازت کے بعد وہ جوان شہید ہوتا ہے تو امامؑ نے اس کے حق میں کی خاص دُعا کی: ''خدایا! اس کے چہرے کو سفید اور نورانی کر دے''۔

نہ سائباں نہ کوئی چاندنی بچھائی ہے یہ جان دے کے جوانی کی نیند آئی ہے

عبرت و نصیحت اور نتائج

۱۔ حق کی راہ میں جان کی پروا کبھی نہ کرنی چاہیے۔

۲۔ امامِ برحق کی ولایت سے الگ ہونا دین کو چھوڑنا ہے اور اس کا ساتھ دینا خدا کے دین کی حمایت کرنا ہے۔

۳۔ باپ کی اطاعت میں بیٹے کا قربان ہونا دینداری کی علامت ہے۔

۴۔ جب کبھی برائیاں سر اٹھائیں تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر سب پر واجب ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے رہبرِ قوم کی زیادہ ذمہ داری بنتی ہے۔

۵۔ یزید اور یزیدی ہمیشہ دنیا میں ہوتے رہے ہیں، حسینی راہ پر چلنے والے رہبر اور حسینؑ والوں کا دفاع ہی اصلِ اسلام ہے۔

۶۔ جوان کی سوچ اور فکر اتنی بلند ہو کہ دینی دفاع میں موت کو شہد ہی سمجھے۔

۷۔ بار بار اور دسیوں، سینکڑوں بار ظالم کا ظلم ہو اور اگر خود حق پر ہو تو کامیابی یقینی ہوگی۔

۸۔ جوانی دیوانی نہیں ہوتی بلکہ قرآن و حدیث اور اولیائے خدا، دیندار جوانوں کی جوانی اور ان کے ایثار و فداکاری کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔

۹۔ ایک دیندار شخص اپنے دینی بھائی کیلئے اتنا ہی عزیز ہونا چاہیے کہ اگر باطل پر رہتے ہوئے

ننہالی رشتہ دار (یا کوئی بھی دنیادار) بھی پناہ یا کسی بھی قسم کے (دنیاوی فائدے) کی لالچ دے تو حق سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے۔

۱۰۔ اپنے خاندان والوں، بہن، بھائی اور بچوں سے وداع وجُدا ہوتے وقت صبر واستقامت اور دین کی حفاظت کی وصیت کرنا ضروری ہے۔

۱۱۔ آخری رمقِ جان اور چلتی ہوئی سانس تک اپنے رہبر اور قائد کو یاد رکھنا چاہیے اور دوسروں کو بھی حقیقی رہبر کی وصیت کرنی چاہیے۔

۱۲۔ دین کی حفاظت میں نئی شادی اور بڑی ہی عزیز و پیاری زوجہ کو بھی بھلایا جاسکتا ہے۔

۱۳۔ ظالم کا ساتھ دینا اور دہشت گردی کی مذمت نہ کرنا اور ڈرانا ودھمکانا اسلامی شعار نہیں اور اسی طرح ظلم کے مقابلے میں خاموش رہنا ظالم کی حمایت کرنا ہے۔

۱۴۔ دشمنوں میں گھرے مظلوموں کی حمایت ہی اسلامی دفاع ہے (جیسے آج فلسطین)۔

آج غزہ میں فلسطینی مسلمانوں پر حملے کے وقت سعودی عرب، خلیجی ممالک، مسلم ریاستیں سب کی سب تادم تحریر خاموش تماشائی ہیں۔ اے دنیا والو!! آنکھیں کھولو۔ صیہونیوں کے ساتھ مل کر سازشوں میں شریک ہو کر بے گناہ بچوں، عورتوں مظلوم انسانوں کے خون کی ہولی انہی کی وجہ سے کھیلی جارہی ہے اور کیا اس کے باوجود ابھی بھی وہ حق پر ہیں؟؟!!!۔

میرے اللہ! اے ارحم الراحمین! اے پروردگار! رحمۃ للعالمین رسول ﷺ کو بھیجنے والے خدا! جس دھرتی کو تو نے امن وامان کا گہوارہ اور آباد ہونے کیلئے بنایا تھا، اُس سے تیری دنیا میں ظلم وجور کتنا بڑھتا جارہا ہے۔ اب اپنے اُس جوان رہبر کو بھیج دے جو ظالموں سے ظلم کا قلع قمع کر کے اس دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دے۔ ایک عرصہ سے ترے اذن کا وہ منتظر ہے جس کے بہت سے ناصر و معین اس کے انتظار کی گھڑیاں گن رہے ہیں اور العجل العجل کہتے کہتے تھکتے نہیں، بلکہ عبادت سمجھ رہے ہیں تو پھر ان کی دعائیں لے اور ان کی فریاد و مناجات کو استجابت کے مرحلہ تک پہنچادے کہ تو ہی ''سمیع و مجیب'' ہے۔

✲✲✲✲✲

کربلا کی خواتین

حجۃ الاسلام مولانا سیّد فدا حسین بخاری

کربلا میں جو حق و باطل کے درمیان معرکہ ہوا اس میں جہاں مردوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے بے مثال قربانیاں پیش کیں وہاں خاندان عصمت وطہارت کی خواتین اور اہل بیت علیہم السلام سے محبت رکھنے والی خواتین نے بھی جذبہ ایثار وقربانی کی وہ لازوال داستان رقم کی کہ جس کی مثال کائنات میں نہیں ملتی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

جو نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی ضرور عطا کریں گے اور ان کے بہترین اعمال کی جزا میں ہم انہیں اجر (بھی) ضرور دیں گے۔[1]

اگر کربلا کے جہاد میں خواتین شامل نہ ہوتیں تو اس کی وہ عظمت نہ ہوتی جو اب اسے حاصل ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام وقت کے امام تھے اور قافلۂ شہداء کے میر کارواں تھے تو سیّدہ زینب سلام اللہ علیہا اُسراء کی قافلہ سالار تھیں اور شہداء کا پیغام پہنچانے کیلئے جو کردار کربلا کی خواتین خصوصاً جناب سیّدہ

---

[1] سورۂ نحل، آیت ۹۷۔

زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا نے انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں:

حدیث عشق دو باب است کربلا و دمشق یکے حسینؑ رقم کرد و دیگری زینبؑ

اس مقالہ میں ان خواتین کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو کربلا میں موجود تھیں اور انہوں نے شہداء کے پیغام کو پہنچایا اور اذیتیں اور مصیبتیں جھیلیں اور اسلام و قرآن کی بقاء کیلئے اسیری کی صعوبتیں برداشت کیں اور نظریہ توحید و نبوت و امامت کے تحفظ کیلئے اپنے بچوں، بھائیوں اور شوہروں کی قربانیاں دیں۔

کربلا کی خواتین میں جس خاتون کا کردار سب سے نمایاں ہے، اس خاتون کے ذکر سے شروع کرتے ہیں:

۱۔ حضرت زینب بنت علی ابن ابی طالب علیہم السلام:

آپؑ کا نام ''زینبؑ'' اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھا۔ آپؑ کے بہت سے القابات ہیں جن میں سے کچھ کا تذکرہ کرتے ہیں:

ثانی زہراء۔ صدیقہ صغریٰ۔ عقیلہ بنی ہاشم۔ عالمہ غیر معلمہ۔ فہیمہ غیر مفہمہ۔ شریکۃ الحسین۔ الکاملہ۔ الفاضلہ۔ المعصومۃ الصغریٰ۔

جناب زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا سنہ ۶ ہجری کو مدینہ منورہ میں متولد ہوئیں۔ آپؑ کی مادر گرامی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا، والد حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام، نانا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نانی جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا، دادا حضرت ابوطالب علیہ السلام اور دادی جناب فاطمہ بنت اسد سلام اللہ علیہا تھیں۔ جس وقت آپؑ کی ولادت ہوئی تو جناب زہراء سلام اللہ علیہا نے حضرت امام علی علیہ السلام کو آپؑ کا نام معین کرنے کیلئے کہا تو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس امر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سبقت حاصل نہیں کر سکتا، لہٰذا جب دونوں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نومولود کی نام گذاری کی تجویز رکھی تو حضورؐ نے فرمایا کہ میں اپنے رب کے فرمان کا منتظر ہوں۔ اسی وقت جناب جبرئیل امینؑ درود و سلام کے ساتھ نازل ہوئے اور فرمایا کہ یا رسول اللہ! اس نومولود کا نام اللہ تعالیٰ نے ''زینب'' معین فرمایا ہے۔ اس طرح آپؑ کا نام ''زینب'' معین ہوا۔ یعنی وہ بیٹی کہ جو اپنے باپ کی زینت ہے۔ نام گذاری کے بعد رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زینب سلام اللہ علیہا

کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور گریہ کرنے لگے۔ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا نے جب گریہ کا سبب پوچھا تو حضورؐ نے ان مصائب کو بیان فرمایا کہ جو آئندہ اس نومولود پر وارد ہونے والے تھے۔ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا نے پوچھا کہ بابا جو میرے اس مولود کی مصیبت پر گریہ کرے گا اس کا ثواب کیا ہوگا؟ تو حضورؐ نے فرمایا: ''جو زینبؑ پر روئے، اسے حسنؑ و حسینؑ پر رونے کا ثواب نصیب ہوگا''۔

جناب زینب کبریٰ کو رسول گرامی قدر، حضرت زہراء، امام علی، امام حسن، امام حسین، امام سجاد اور امام باقر علیہم السلام کی مصاحبت کا شرف حاصل ہوا۔ آپ علم و تقویٰ و زہد کے بلند مرتبہ پر فائز تھیں۔ حضرت امام سجاد علیہ السلام نے آپؑ کے بارے میں فرمایا:

اَنْتِ بِحَمْدِ اللهِ عَالِمَةٌ غَيْرُ مُعَلَّمَةٍ. فَهِمَةٌ غَيْرُ مُفَهَّمَةٍ۔

بحمد اللہ آپؑ ایسی عالمہ ہیں کہ جن کا کوئی معلم نہیں اور ایسی فہمیدہ ہیں کہ کسی کو انہیں سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔[1]

آپؑ نے مذکورہ معصومین علیہم السلام سے روایات نقل کی ہیں اور آپؑ سے بیشمار اصحاب پیغمبرؐ نے بھی روایت کی ہے جن میں عبداللہ ابن عباس، عبداللہ بن جعفر، محمد بن عمرو الہاشمی، عطاء بن سائب رضی اللہ عنہم جیسے اصحاب شامل ہیں۔

مؤرخ شیخ عبداللہ مامقانی لکھتے ہیں کہ چونکہ امام سجاد علیہ السلام کربلا میں بیمار تھے، لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے امامت کی بعض امانتیں جناب زینب سلام اللہ علیہا کے سپرد کیں اور چند وصیتیں بھی آپؑ کو فرمائیں۔ یہاں تک کہ امام حسین علیہ السلام اور امام سجاد علیہ السلام دونوں نے آثار ولایت اور احکام الٰہیہ کو بیان کرنے میں آپؑ کو اپنی نائب خاصہ بنایا تھا۔ اسی لئے لوگ حضرت امام سجاد علیہ السلام کی شفایابی تک حلال و حرام الٰہی کے جاننے کیلئے جناب زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کی طرف رجوع کرتے تھے۔

آپؑ کے فہم و علم کا یہ عالم تھا کہ امام علی علیہ السلام نے کمسنی میں آپؑ سے فرمایا کہ اے میری نور نظر! (واحد) کہو تو جناب زینبؑ نے اپنی زبان سے واحد کہا، پھر امامؑ نے فرمایا بیٹا اثنین (دو) کہو تو آپؑ نے

---

[1] بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۱۹۹۔

فرمایا: میں اپنی زبان کہ جس سے ابھی ابھی میں نے واحد کہا اثنین (دو) کیسے کہہ سکتی ہوں؟ اس سے آپؑ کا اشارہ خدا کے ایک ہونے (توحید) کی طرف تھا۔

جب حضرت امیر سنہ ۲۶ھ میں کوفہ تشریف لے گئے تو لوگوں کی درخواست پر جناب زینب سلام اللہ علیہا نے عورتوں کو تفسیر قرآن اور دوسرے علوم دینیہ سے بہرہ مند فرمایا۔ ایک مرتبہ آپؑ عورتوں سے کہیعص کی تفسیر فرما رہی تھیں کہ حضرت امام علی علیہ السلام گھر میں داخل ہوئے اور آپؑ نے بیٹی کی آواز سنی تو فرمایا: اے زینبؑ! یہ حروف کربلا میں آپؑ کے بھائی حسینؑ پر نازل ہونے والی مصیبت کو بیان کرتے ہیں۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا کی شادی جناب عبداللہ بن جعفر طیارؑ سے ہوئی۔ اگرچہ کئی خواستگاروں نے خواستگاری کی، لیکن امام علی علیہ السلام نے سب کو رد فرمایا۔ جب آپؑ اپنے شوہر کے گھر تشریف لائیں تو جناب عبداللہ کے مال میں برکت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے عبداللہ کو مال کثیر عطا فرمایا، لیکن شوہر کے یہاں سب کچھ ہونے کے باوجود بی بیؑ کے زہد کا یہ عالم تھا کہ امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّهَا مَا ادَّخَرَتْ شَيْئًا مِنْ يَوْمِهَا لِغَدِهَا اَبَدًا۔

میری پھوپھی جناب زینبؑ نے کبھی بھی کل کیلئے کوئی شے بچا کر نہیں رکھی۔[1]

حضرت امام سجاد علیہ السلام کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ جناب زینب سلام اللہ علیہا جو کچھ گھر میں ہوتا یا تو اسے مصرف میں لے آتیں یا پھر راہ خدا میں خرچ کر دیتیں۔

آپؑ کی عفت و پاکدامنی کا عالم یہ تھا کہ اگرچہ آپ عصمت کبریٰ کے درجہ پر فائز نہیں تھیں، لیکن آپؑ کو عصمت صغریٰ ضرور حاصل تھی۔ ابھی آپ کا بچپن تھا لیکن یحییٰ مازنی کہتا ہے کہ میرا گھر حضرت علی علیہ السلام کے پڑوس میں تھا لیکن نہ میں نے کبھی زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کو دیکھا اور نہ ہی کبھی ان کی آواز سنی۔ جب بھی آپؑ اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کو جاتیں تو رات میں گھر سے اس حالت میں نکلتیں کہ امام حسن علیہ السلام آپؑ کے دائیں اور امام حسین علیہ السلام آپؑ کے بائیں جانب اور حضرت علی علیہ السلام آپؑ کے آگے ہوتے تھے اور جب روضۂ رسولؐ پر پہنچتیں تو حضرت علی علیہ السلام قندیلوں کو بجھا دیا کرتے تھے۔

---

[1] وفیات الائمہ، ص ۴۴۱۔

ایک مرتبہ جب امام حسن علیہ السلام نے چراغ بجھانے کی وجہ پوچھی تو آپؑ نے فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ لوگ آپؑ کی بہن کو دیکھ سکیں۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ آپؑ نے کبھی نوافل کو ترک نہیں فرمایا۔ اسی لئے حضرت امام حسین علیہ السلام نے وقت وداع فرمایا تھا:

یَآ اُخْتَاهُ! لَا تَنْسِیْنِیْ فِیْ نَافِلَةِ اللَّیْلِ۔

اے میری بہن زینبؑ! مجھے نماز شب میں فراموش نہ کرنا۔[1]

جناب فاطمہ بنت حسین علیہا السلام فرماتی ہیں کہ جناب زینب سلام اللہ علیہا نے شب عاشور بھی نماز شب کو ترک نہیں فرمایا۔ امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا کہ میری پھوپھی نے کربلا سے شام کے سفر کی مشقتوں میں کسی بھی وقت نماز شب کو ترک نہیں فرمایا۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ آپؑ نماز بیٹھ کر ادا کر رہی ہیں تو پوچھا: اے پھوپھی! آپؑ کے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا کیا سبب ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا کہ دشمن ہم سب کو چوبیس گھنٹے میں صرف ایک ایک روٹی دیتے ہیں، لہٰذا بچوں کی بیتابی کو دیکھ کر میں اپنا حصہ انہیں دے دیتی ہوں جس کی وجہ سے میرے بدن پر اس قدر ضعف طاری ہے کہ میں بیٹھ کر نوافل ادا کرتی ہوں۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا کا فرمان ہے کہ ایسی عبادت گزار تھیں کہ آپؑ کی عبادت کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ﴾

اے رسولؐ! یقیناً آپ کا پروردگار جانتا ہے کہ آپ کبھی رات کی دو تہائی کے قریب کبھی نصف شب اور کبھی ایک تہائی (نماز کیلئے) قیام کرتے ہیں اور ایک گروہ آپؐ کے ساتھیوں میں سے بھی آپؐ کے ساتھ عبادت کیلئے کھڑا ہوتا ہے۔[2]

---

[1] عوالم العلوم، ج ۱۱، ص ۹۵۴۔

[2] سورۂ مزمل، آیت ۲۰۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا نے اس آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا کہ مذکورہ آیت میں ''گروہ'' سے مراد ہم ہیں جو اپنے جدّ امجدؐ کے ساتھ عبادت کیلئے کھڑے ہوتے تھے۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا نے اپنے دونوں فرزندوں کے ساتھ کربلا میں شرکت کی اور امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپؑ کے قیام وشہادت کے مقاصد کو مسلمانوں کے گھر گھر منتقل فرمایا۔ آپؑ نے مصیبتوں پر ایسا صبر فرمایا کہ تاریخ میں کوئی بی بی نظر نہیں آتی کہ جن پر ایک دن میں اس قدر مصائب پڑے ہوں اور اس کے باوجود وہ صبر کی اس منزل پر فائز ہوئی ہو کہ جب ابن زیاد نے پوچھا کہ تمہارا اس اللہ کے بارے میں کیا خیال ہے جس نے تمہارے بھائی حسین علیہ السلام کے ساتھ ایسا سلوک کیا؟ تو آپؑ نے فرمایا:

مَا رَاَیْتُ اِلَّا جَمِیْلًا هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ کَتَبَ اللهُ عَلَیْهِمُ الْقَتْلَ فَبَرَزُوْا اِلٰی مَضَاجِعِهِمْ وَ سَیَجْمَعُ اللهُ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهُمْ فَتُحَاجُّ وَ تُخَاصَمُ فَانْظُرْ لِمَنِ الْفَلْجُ یَوْمَئِذٍ ثَکِلَتْكَ اُمُّكَ یَا ابْنَ مَرْجَانَةَ!۔

میں نے حکم پروردگار میں خوبی وزیبائی کے علاوہ کوئی شے نہیں دیکھی، ہم وہ قوم ہیں جن کیلئے خدا نے درجہ شہادت کو قلم قدرت سے لکھ دیا ہے انہوں نے طریق الٰہی کو سامنے رکھا اور وہ اپنی مقتل کی طرف گئے اور اللہ تعالیٰ عنقریب تجھے اور انہیں جمع فرمائے گا اور اس وقت اس عادل حقیقی کی بارگاہ میں مقدمہ پیش ہوگا۔ اس وقت تمہیں اچھی طرح معلوم ہوجائے گا کہ کون کامیاب ہوگا؟ اومرجانہ کے جائے! تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے۔[1]

جناب زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا صابرہ ہونے کے ساتھ ساتھ شجاع بھی تھیں جس کا اندازہ آپؑ کے کوفہ وشام میں دیئے گئے خطبات سے لگایا جاسکتا ہے۔ انہی خطبوں کے نتیجہ میں ابن زیاد و یزید جیسے طاغوت زمانہ آپؑ کے سامنے زبان درازی نہ کرسکے۔ یہاں تک کہ جب آپؑ شام سے مدینہ واپس لوٹیں تو آپؑ نے اہل مدینہ کے سامنے کربلا میں چشم دیدہ مصائب کی تصویر کشی کی جس کہ وجہ سے مدینہ والوں میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ والی مدینہ نے جب اس بات کی خبر یزید تک پہنچائی تو یزید نے حکم دیا

---

[1] بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۱۱۶۔

کہ جناب زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کو کسی صورت مدینہ چھوڑنے پر مجبور کیا جائے۔ جناب زینب سلام اللہ علیہا بنی ہاشم کی چند عورتوں کے ساتھ مدینہ سے آخری مرتبہ رخصت ہوئیں اور ۲۷ رجب یا شعبان سنہ ۶۱ ھ کے اوائل میں شہر مصر میں داخل ہوئیں۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں جناب زینب سلام اللہ علیہا کی شہادت اسی شہر میں واقع ہوئی اور شام میں آپؑ کی بہن جناب اُمّ کلثوم سلام اللہ علیہا (زینب صغریٰ بنت علیؑ و فاطمہ) دفن ہیں، جبکہ دیگر علماء کا قول یہ ہے کہ مصر کے بعد آپؑ شام تشریف لائیں جہاں آپؑ کی شہادت واقع ہوئی اور موجودہ مقبرہ جناب زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا سے منسوب ہے۔

۲۔ حضرت اُمّ کلثوم بنت علی بن ابی طالب علیہم السلام:

آپؑ کا نام ''زینب صغریٰ'' اور آپؑ کی کنیت ''اُمّ کلثوم'' تھی۔ آپؑ کی ولادت ۱۶ شعبان سنہ ۹ ھ ق میں واقع ہوئی۔ آپؑ کا عقد حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنے بھتیجے جناب عون بن جعفر طیارؓ سے فرمایا تھا۔ جناب اُمّ کلثوم کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ دونوں زوجہ و شوہر کربلا میں حاضر ہوئے جہاں دین اسلام کی بقاء کیلئے جناب عونؓ نے جام شہادت نوش فرمایا۔

بعد از واقعہ عاشورہ جناب سیّدہ اُمّ کلثوم اسیر ہوئیں اور جناب زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کی طرح کوفہ اور شام میں آپؑ نے فصیح و بلیغ خطبے ارشاد فرمائے۔ مدینہ واپسی کے بعد ۶۱ ھ ہی میں آپؑ نے دار فانی کو وداع کیا۔

آپؑ نے اہل کوفہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

> اے اہل کوفہ! تمہارے چہرے سیاہ ہو جائیں۔ تم نے امام حسین علیہ السلام کو میدان جنگ میں تنہا چھوڑ دیا اور ان کو قتل کر دیا اور اسی بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے مال و اسباب کو لوٹا اور ان کے اہل حرم کو اسیر کر لیا اور اذیتیں دیں۔ تم تباہ ہو جاؤ! جانتے ہو تم نے کتنا بڑا جرم کیا ہے اور اس کا وبال تمہاری گردنوں پر ہے۔

حضرت بی بی اُمّ کلثوم سلام اللہ علیہا اسیری سے رہائی کے بعد مدینہ پہنچنے پر جب نگاہ روضہ رسول کریمؐ پر پڑی تو فرمایا:

مَدِيْنَةَ جَدِّنَا لَا تَقْبَلِيْنَا فَبِالْحَسَرَاتِ وَ الْاَحْزَانِ جِئْنَا

خَرَجْنَا مِنْكِ بِالْاَهْلِيْنَ جَمْعًا رَجَعْنَا لَا رِجَالَ وَّ لَا بَنِيْنَا

اے ہمارے جد امجد کے مدینہ! تو ہمیں قبول نہ کر کہ ہم بڑی حسرت اور حزن لے کر واپس آئے ہیں۔ جب ہم گئے تو ہمارا پورا کنبہ آباد تھا مگر جب لوٹے تو نہ ہمارے مرد ساتھ تھے اور نہ بچے۔

۳۔ حضرت رقیہ بنت علی علیہما السلام:

آپؑ حضرت امام علی علیہ السلام کی بیٹی تھی۔ آپؑ کی شادی حضرت مسلم بن عقیلؑ سے ہوئی۔ آپؑ کے دو بیٹے کوفہ میں شہید کئے گئے اور آپؑ کے شوہر امام حسین علیہ السلام کے سفیر تھے جو کوفہ میں شہید ہوئے۔ آپؑ کی بیٹی عاتکہ کی شہادت کربلا میں ہوئی۔ شام غریباں جب سادات کے خیموں پر حملے ہوئے تو آپؑ کی بیٹی عاتکہ گھوڑوں کے سموں تلے آ کے شہید ہوئیں۔ سیّدہ رقیہ سلام اللہ علیہا نے اسیری کی صعوبتیں برداشت کیں اور حضرت امام سجاد علیہ السلام کے ساتھ مدینہ واپس لوٹیں۔

۴۔ حضرت رباب بنت امرئ القیس بن عدی الکلبیہ:

آپ کا شمار زمانے کی بہترین اور افضل خواتین میں ہوتا ہے۔ آپؑ کے والد عیسائی تھے جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں شام سے مدینہ تشریف لائے اور اسلام قبول کیا۔ اسے قبیلہ قضاعہ کا امیر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے مدینہ میں حضرت علی علیہ السلام سے ملاقات کی اس وقت امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام بھی حضرت علی علیہ السلام کے ہمراہ تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنا تعارف کروایا اور کہا کہ میں علی بن ابی طالبؑ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چچازاد بھائی اور ان کا داماد ہوں اور یہ میرے بیٹے ہیں جن کی ماں رسول اکرمؐ کی بیٹی سیّدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا ہیں۔ ہم آپؑ کے ساتھ رشتہ داری کرنا چاہتے ہیں۔ امرئ القیس نے کہا: یا علیؑ! میری ایک بیٹی جس کا نام محیاۃ ہے اس کا عقد آپؑ سے کرنا چاہتا ہوں، دوسری بیٹی ہے جس کا نام سلمٰی ہے اس کی شادی آپؑ کے بیٹے امام حسنؑ سے کرنا چاہتا ہوں اور تیسری بیٹی جس کا نام رباب ہے اس کی شادی امام حسینؑ سے کرنا چاہتا ہوں۔ صاحب کتاب اغانی کہتے ہیں: اسی دن رباب بن القیس کا نکاح حضرت امام حسین علیہ السلام سے ہو گیا۔ امرالقیس عرب کے بزرگ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا بھائی

زمانہ جاہلیت میں بحرین کا امیر بھی رہ چکا تھا۔

حضرت رباب ؓ حضرت امام حسین علیہ السلام کے نزدیک بڑی منزلت رکھتی تھیں۔ امام حسین علیہ السلام اپنی اس بیوی سے خاص محبت رکھتے تھے۔ آپؑ نے ان کیلئے اور اپنی پیاری بیٹی سکینہ کیلئے یہ اشعار کہے ہیں:

لَعَمْرُكَ اِنَّنِیْ لَاُحِبُّ دَارًا تَكُوْنُ بِهَا سُكَيْنَةُ وَ الرَّبَابُ

اُحِبُّهُمَا وَ اَبْذُلُ جُلَّ مَالِیْ وَ لَيْسَ لِعَاتِبٍ عِنْدِیْ عِتَابُ

تیری جان کی قسم! میں اس گھر کو دوست رکھتا ہوں جس گھر میں سکینہؑ اور رباب ؓ ہوں۔ ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں اور ان دونوں کیلئے اپنا پورا مال خرچ کر سکتا ہوں۔ اس میں کسی ملامت کرنے والے کیلئے ملامت کا کوئی حق نہیں ہے۔

حضرت رباب ؓ کا بیٹا عبداللہ (علی اصغرؑ) کربلا میں شہید ہوا اور بیٹی سکینہ اور خود اسیر ہوئیں۔ آپؑ نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد اسیری کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اسیری کے بعد مدینہ واپس آئیں اور ایک سال تک امام مظلومؑ کی شہادت پر گریہ و نالہ و زاری کی اور ۶۲ ھ میں وفات پائی۔

۵۔ سکینہ بنت الحسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام:

جناب سکینہ مدینہ منورہ میں متولد ہوئیں۔ آپؑ کے والد بزرگوار حضرت امام حسینؑ اور والدہ ماجدہ جناب رباب بنت امرئ القیس تھیں۔ آیت اللہ محمد صادق الکرباسی کے نزدیک شام میں شہید ہونے والی امام حسینؑ کی بیٹی کا نام رقیہ تھا جن کی قبر اسی نام سے دمشق میں موجود ہے۔ اگرچہ بعض دیگر علماء کا نظریہ یہ بھی ہے کہ جناب سکینہ و جناب رقیہ ایک ہی فرد کے دو نام ہیں۔ واللہ عالم۔

واضح رہے کہ جناب فاطمہ کبریٰ، حضرت رقیہ اور جناب عبداللہ رضیع کے اسماء کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سلاطین وقت اور مؤرخین کی اہلبیتؑ کے ساتھ عداوت و دشمنی تھی۔ ایک وجہ ایک جیسے ناموں کا کثرت سے استعمال بھی تھی۔ مثلاً ''فاطمہ کبریٰ، فاطمہ وسطیٰ اور فاطمہ صغریٰ'' یا ''علی اکبر، علی اوسط، علی اصغر'' وغیرہ۔[1]

[1] قارئین اس ضمن میں آیت اللہ صادق الکرباسی کی مفصل کتاب ''حسینی دائرۃ المعارف'' سے رجوع کر سکتے ہیں۔

۶۔اُمِ اسحاق بنت طلحہ رضی اللہ عنہا:

ان کی ولادت تقریباً ۳۰ھ اور وفات سنہ ۹۳ھ میں ہوئی۔آپ پہلے حضرت امام حسن علیہ السلام کے عقد میں تھیں ان کی شہادت کے بعد ان کی وصیت کے مطابق امام حسین علیہ السلام نے ان سے عقد کیا۔آپ کربلا میں موجود تھیں۔امام علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپ نے بھی اسیری کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔

۷۔فضہؑ نوبیہ:

جناب فضہ رضی اللہ عنہا تقریباً سنہ ۲۵ قبل از ہجرت متولد ہوئیں۔جب آپ رسول گرامی قدر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تشریف لائیں اور مسلمان ہوئیں تو حضورؐ نے آپ کو آزاد فرمایا لیکن جناب فضہ رضی اللہ عنہا نے آزادی کے باوجود رسولؐ وآل رسولؐ کی کنیزی میں اپنی زندگی وقف کردی۔حضرت زہرا سلام اللہ علیہا نے جناب فضہؓ کے ساتھ اس طرح دن تقسیم کئے کہ ایک روز خود بی بی خانہ داری فرماتیں اور دوسرے دن یہی ذمہ داریاں جناب فضہؓ کے سپرد ہوتیں۔جناب فضہ رضی اللہ عنہا کی عظمت کیلئے یہی کافی ہے کہ خود رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کا نام ''فضہ'' رکھا اور آپ کو مشکلات کے موقع پر اس دُعا کے پڑھنے کا حکم فرمایا:

یَا وَاحِدُ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ اَحَدٌ. تُمِیْتَ کُلَّ اَحَدٍ وَّ تُفْنِیْ کُلَّ اَحَدٍ. اَنْتَ عَلٰی عَرْشِكَ وَاحِدٌ. لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ۔

اے واحد کہ تجھ جیسا کوئی واحد نہیں ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر کسی کی موت اور فنا ہے۔تو عرش پر بھی اکیلا ہے، تجھے نہ نیند آتی ہے اور نہ کوئی اونگھ۔[1]

جناب فضہ رضی اللہ عنہا نے رسول گرامی قدر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ واہلبیت علیہم السلام کے ہر فرد سے علمی استفادہ کیا۔یہاں تک کہ واقعہ اطعام مسکین ویتیم واسیر میں آپ نے حضرات حسنین شریفینؑ کی شفایابی کیلئے روزے رکھے اور تین روز مسلسل اہلبیتؑ کی پیروی کرتے ہوئے یتیم، مسکین اور اسیر کو اپنے حصہ کی روٹیاں عطا کیں۔

آپ نے اہلبیت اطہار علیہم السلام سے اس قدر کسب فیض فرمایا کہ چالیس سال تک صرف قرآن مجید کی

---

[1] عوالم العلوم، ج۱۱، ص ۱۰۴۳۔

آیات کے ذریعہ گفتگو کی۔ مشہور مؤرخ ابوالقاسم القشیری لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص مکہ جاتے ہوئے اپنے قافلے سے بچھڑ گیا کہ اثنائے راہ میں اس نے ایک خاتون (جناب فضہ رضی اللہ عنہا) کو دیکھا جو اکیلی جارہی تھیں۔ اس شخص کا بیان ہے:

میں نے کہا: آپ کون ہیں؟ خاتون نے کہا: ﴿وَقُلْ سَلٰمٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾[1]: ''اور سلام کہو، عنقریب انہیں معلوم ہوجائے گا''۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے سلام کرنے کا کہہ رہی ہیں چنانچہ میں نے انہیں سلام کیا اور پوچھا: آپ اس صحرا میں کیا کر رہی ہیں؟ تو خاتون نے کہا: ﴿وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ﴾[2]: ''جسے خدا ہدیت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے''۔ یعنی میں قافلہ سے بچھڑ گئی ہوں۔ میں نے کہا: آپ کہاں سے تشریف لا رہی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ﴿اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ﴾[3]: ''اور ان لوگوں کو بہت دور سے پکارا جائے گا''۔ یعنی میں بہت دور سے آ رہی ہوں۔ میں نے پوچھا: اور آگے کہاں کا قصد رکھتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾[4]: ''اور اللہ کیلئے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا واجب ہے''۔ یعنی میں حج کیلئے جارہی ہوں۔ میں نے پوچھا: آپ قافلہ سے کب جدا ہوئیں؟ خاتون نے جواب دیا: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ﴾[5]: ''اور ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی مخلوقات کو چھ دن میں پیدا کیا ہے''۔ یعنی میں سمجھ گیا کہ انہیں اپنے قافلے سے بچھڑے ہوئے چھ دن ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا: کیا آپ کھانا تناول فرمائیں گی؟ انہوں نے جواب دیا: ﴿وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ﴾[6]: ''اور ہم نے ان لوگوں کیلئے ایسا جسم نہیں بنایا جو کھانا نہ کھاتا ہو''۔ یعنی میں کھانا کھانا چاہتی

---

[1] سورۂ زخرف، آیت ۸۹۔

[2] سورۂ زمر، آیت ۳۷۔

[3] سورۂ فصلت، آیت ۴۴۔

[4] سورۂ آل عمران، آیت ۹۷۔

[5] سورۂ ق، آیت ۳۸۔

[6] سورۂ انبیاء، آیت ۸۔

ہوں۔ چنانچہ میں نے انہیں کھانا کھلایا اور کہا میرے پیچھے تیز تیز چلیں۔ خاتون نے کہا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾[1]: ''اللہ کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا''۔ یعنی میں اپنی طاقت کے مطابق ہی تیز چل سکوں گی۔ میں نے کہا: کیا میں آپ کے ساتھ ایک سواری پر بیٹھ سکتا ہوں؟ انہوں نے جواب دیا: ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾[2]: ''اگر زمین و آسمان میں اللہ کے علاوہ اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان دونوں برباد ہو جاتے''۔ یعنی نامحرم کے ساتھ ایک سواری پر بیٹھنا موجب فساد ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر میں سواری سے اتر آیا اور انہیں سوار کیا۔

ہم دونوں نے سفر شروع کیا یہاں تک کہ قافلے سے جا ملے۔ یہاں پہنچ کر میں نے پوچھا: کیا قافلہ میں آپ کا کوئی ساتھی ہے؟ انہوں نے جواب میں چار آیات کی تلاوت کی: ﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ﴾[3]: ''اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں اپنا جانشین بنایا ہے''، ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾[4]: ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صرف ایک رسول ہیں''، ﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ﴾[5]: ''اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی سے تھام لو'' اور ﴿يٰمُوْسٰى... اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ﴾[6]: اے موسیٰ!۔۔۔ بیشک میں ہی اللہ ہوں''۔ میں نے یہ چار نام پکارے تو چار جوان آئے۔ میں نے بی بی سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا: ﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾[7]: ''مال اور اولاد زندگانی کی زینت ہیں''۔ یعنی یہ میرے فرزند ہیں۔ چنانچہ سب بیٹے ماں سے ملنے کیلئے قریب ہوئے تو بی بی نے کہا: ﴿يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ﴾[8]: ''اے بابا! اس کو اجرت پر رکھ لیجئے کیونکہ اچھا مزدور جسے

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۶۔

[2] سورۂ انبیاء، آیت ۲۲۔

[3] سورۂ ص، آیت ۲۶۔

[4] سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۴۔

[5] سورۂ مریم، آیت ۱۲۔

[6] سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۔ ۱۴۔

[7] سورۂ کہف، آیت ۴۶۔

[8] سورۂ قصص، آیت ۲۶۔

آپؑ اجرت پر رکھیں وہی ہے جو طاقتور بھی ہو اور امانتدار بھی''۔ یہ سن کر بیٹوں نے مجھے کچھ تحائف بطور اجرت دیئے۔ اس پر بی بی بولیں: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾[1]: ''اور خدا جس کیلئے چاہتا ہے اور بڑھا دیتا ہے''۔ میں سمجھ گیا کہ بی بی تحائف میں اضافہ کا کہہ رہی ہیں چنانچہ بچوں نے تحائف میں اضافہ کر دیا۔ اس پر میں نے ان سے پوچھا کہ یہ خاتون کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا: یہ ہماری مادر گرامی جناب فضہ رضی اللہ عنہا کنیز حضرت زہرا سلام اللہ علیہا ہیں جو گزشتہ بیس سال سے قرآن کے ذریعے گفتگو کر رہی ہیں۔[2]

اس واقعے سے جناب فضہ رضی اللہ عنہا کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس روایت کے مطابق بیس سال اور ایک اور روایت کے مطابق چالیس سال تک آپ نے قرآنی آیات کے ذریعہ گفتگو کی۔ یہ وہ فیض ہے کہ جسے یقیناً آپ نے اہلبیت اطہار علیہم السلام کے ساتھ زندگی گزارنے سے حاصل کیا ہے۔

جناب فضہ رضی اللہ عنہا رسول گرامی قدر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد تمام مظالم میں جناب فاطمہ زہراؑ کی مددگار ثابت ہوئیں۔ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو بھی حضرت فضہ سے بڑی قربت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب بی بیؑ کی شہادت کا وقت قریب ہوا تو آپؑ نے مولا علی علیہ السلام سے فرمایا کہ یا علیؑ! میری موت کی خبر عورتوں میں صرف اُم سلمہؓ، اُمّ ایمنؓ اور فضہؓ کو دی جائے۔ بی بیؑ کی شہادت کے بعد جناب فضہ، مولا علیؑ اور آپؑ کے تمام فرزندوں اور بیٹوں کی خدمت میں رہیں۔ یہاں تک کہ جب حضرت علی علیہ السلام اپنے دور حکومت میں مدینہ سے کوفہ تشریف لائے تو جناب فضہ بھی آپ کے ساتھ تھیں جو آپؑ کیلئے غذا مہیا فرماتی تھیں۔ آپؑ نے حضرت امیر علیہ السلام کی اس قدر خدمت کی کہ حضرت علی علیہ السلام نے آپؑ کیلئے دُعائیہ جملوں میں فرمایا:

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ فِضَّتِنَا۔

اے اللہ! ہماری فضہ کو ہمارے لئے مبارک قرار دے۔[3]

حضرت علی علیہ السلام نے آپ کا عقد ابو ثعلبہ حبشی سے فرمایا جن سے اللہ نے آپ کو ایک فرزند عطا کیا۔

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۲۶۱۔

[2] بحار الانوار، ج ۴۳، ص ۸۶۔

[3] الثاقب فی المناقب، ص ۲۸۱۔

ابوثعلبہ کی وفات کے بعد آپ کا عقد ابوملیک عطفانی سے ہوا۔ آپ کی اولاد کے نام تاریخ میں کچھ اس طرح درج ہیں: ۱۔ داؤد۔ ۲۔ محمد۔ ۳۔ یحییٰ۔ ۴۔ موسیٰ۔ ۵۔ ابراہیم۔ ۶۔ مسکہ (بیٹی)۔

اولاد اور شوہر کی ذمہ داریوں کے باوجود جناب فضہ رضی اللہ عنہا امام حسین علیہ السلام اور اہل بیت حرم کے ساتھ کربلا تشریف لائیں جس کے بعد آپ نے اسیری کے ستم سہے اور جناب زینبؑ کی خدمت میں رہیں یہاں تک کہ بی بی زینبؑ نے وفات پائی۔ آپ کی وفات ۶۲ ھ میں ۹۷ برس میں شام میں واقع ہوئی آپ کا مزار شام میں ہے۔

کربلا میں اسیر بنائی جانے والی بیبیاں

حسینی دائرۃ المعارف کے مطابق وہ بیبیاں کہ جو کربلا میں حاضر ہوئیں اور اسیر بنائی گئیں:

۱۔ أم احمد بن عقيل الهاشمي

۲۔ أم اسحاق بنت طلحه التيمية

۳۔ ام الحسن بنت على الهاشمية

۴۔ أم خديجه بنت على الهاشمي

۵۔ ام رافع سلمه القبطية

۶۔ ام شعب المخزومية

۷۔ ام فاطمه بنت على الهاشمي

۸۔ ام قاسم بن محمد الطيار

۹۔ ام كلثوم الصغرى بنت عبدالله الطيار الهاشمية

۱۰۔ ام كلثوم بنت عباس الهاشمية

۱۱۔ ام كلثوم الكبرى بنت على الهاشمية

۱۲۔ ام محمد بن ابو سعيد الهاشمي

۱۳۔ بره بنت النوشجان الفارسية

۱۴۔ بحرية بنت مسعود الخزرجية

۱۵۔جمانہ بن ابی طالب الہاشمیة

۱۶۔حبیبہ (ام عبدالرحمن بن الحسن)

۱۷۔حسنیة (ام منحج بن سہم المدنی)

۱۸۔حمیدة بنت مسلم الہاشمیة

۱۹۔خدیجہ بن مسلم الہاشمیة

۲۰۔خلیلة ام عبداللہ الہاشمیة

۲۱۔الخوصاء بنت حفصہ الوائلیة

۲۲۔الخوصاء بنت عمرو الوائلیة

۲۳۔رباب بنت امری ءالقیس الکلبیة

۲۴۔رقیة الصغری بنت علی الہاشمیة

۲۵۔رملة الکبری بنت علی الہاشمیة

۲۶۔رملة (ام القاسم ابن الحسن الرومیة)

۲۷۔روضة (خادمة الرسول) المدنیة

۲۸۔زینب الصغریٰ بنت علی الہاشمیة

۲۹۔زینب الکبری بن علی الہاشمیة

۳۰۔سکینہ بنت الحسین الہاشمیہ

۳۱۔سلافنہ مربیة الامام السجاد

۳۲۔سلمی ام الرافع القبطیة

۳۳۔ہانیة (ام فاطمہ بنت الحسن)

۳۴۔صفیة بنت علی الہاشمیة

۳۵۔الصہباء بنت عباد الثعلبیة

۳۶۔عزالة ام عبداللّٰہ امة الامام السجاد

۳۷۔فاختہ بنت علی الہاشمیة

۳۸۔فاطمہ بنت الحسن الہاشمیۃ

۳۹۔فاطمۃ الصغری بنت الحسین الہاشمیۃ

۴۰۔فاطمۃ الصغری بنت علی الہاشمیۃ

۴۱۔فاطمہ بنت عقبۃ الخزرجیۃ

۴۲۔فاطمۃ الکبری بنت الحسین الہاشمیۃ

۴۳۔فضہ (خادمۃ الزہراء) النبویۃ

۴۴۔فکیہۃ (امۃ الحسین)

۴۵۔قفیرۃ بنت علقمۃ الہلالیۃ

۴۶۔کبشتہ المدنیۃ

۴۷۔لیلی بنت ابی مرۃ الثقفیۃ

۴۸۔لیلی بن مسعود النہشلیۃ

۴۹۔ملیکۃ بنت الاحنف التیمیۃ

۵۰۔ملیکۃ المدنیۃ

۵۱۔میمونہ بنت علی الہاشمیۃ

۵۲۔میمونہ (ام عبداللہ بن یقطر الحمیری)

۵۳۔نفیسہ بنت علی الہاشمیۃ

۵۴۔نفیلہ المدنیۃ

✲✲✲✲✲

ولی عہدی امام رضا علیہ السلام کا مسئلہ [1]

(ایک تحقیقی جائزہ)

پہلا حصہ

استاد شہید آیۃ اللہ مرتضیٰ مطہریؒ

موضوع بحث انتہائی اہم مسئلہ ہے، مسئلہ امامت وخلافت۔ اس کو ہم حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کی طرف لے آتے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے یہ مسئلہ بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مامون الرشید حضرت امام رضا علیہ السلام کو مدینہ سے سرزمین خراسان "مرو" میں لے آیا اور آپؑ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔ ولیعہد یا ولی عہد دونوں لفظوں کا معنیٰ ومفہوم ایک ہی ہے۔ یہ اس دور کی اصطلاح میں استعمال ہوتا تھا۔ میں نے چند سال قبل اس مسئلہ پر غور کیا تھا کہ یہ کلمہ کس تاریخ کی پیداوار ہے۔ صدر اسلام میں تو تھا ہی نہیں۔ جب موضوع ہی نہ تھا تو پھر لغت کیسی؟ پھر یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ اس قسم کی اصطلاح بعد والے زمانے میں استعمال میں لائی گئی۔ سب سے پہلے امیر شام نے اس اصطلاح کو اپنے بیٹے یزید کیلئے استعمال کیا، لیکن اس نے اس کا کوئی خاص نام نہیں رکھا تھا، بلکہ اس نے یزید کیلئے بیعت کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس لیے ہم اس لفظ کو اس دور کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کی صلح کے وقت بھی یہ لفظ زیر بحث آیا۔ تاریخ کہتی ہے کہ امام علیہ السلام نے حکومت امیر شام کے حوالے کر دی اور امام علیہ السلام کے نزدیک حاکم وقت کو اپنے حال پر رہنے دینا ہی وقت کا اہم تقاضا تھا۔

---

[1] اقتباس از کتاب "سیرت آل محمدؐ"، استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ۔ بشکریہ از: (http://shiastudies.net)۔

یہاں پر ممکن ہے کہ کچھ لوگ اعتراض کریں کہ اگر امام حسن علیہ السلام نے ایسا کیا ہے تو دوسرے آئمہ طاہرین علیہم السلام کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا ایک امام کا اقدام صحیح ہے اور دوسروں کا نہیں؟ حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام رضا علیہ السلام کو حکام وقت کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ دونوں پرچم جہاد بلند کرتے ہوئے شہید ہو جاتے تو بہتر تھا؟

(اس مقالے میں) ہم نے انہی اعتراضات کا جواب دینا ہے، تاکہ بدگمانیوں کا خاتمہ ہو اور لوگوں کو حقائق کے بارے میں پتہ چل سکے۔ ہم حضرت امام رضا علیہ السلام کے دور امامت میں پیش آنے والے تاریخی واقعات کو بیان کریں گے اور ان کا تجزیہ کریں گے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ امام رضا علیہ السلام نے مامون الرشید کی ولی عہدی قبول فرمائی؟

علویوں کے ساتھ عباسیوں کا رویہ

مامون الرشید عباسی سلطنت کا وارث ہے۔ عباسیوں نے شروع ہی میں علویوں کے ساتھ مقابلہ کیا یہاں تک کہ بہت سے علوی عباسیوں کے ہاتھوں قتل بھی ہوئے۔ اقتدار کے حصول کیلئے جتنا ظلم عباسیوں نے علویوں پر کیا وہ بنوامیہ سے کسی صورت میں کم نہ تھا، بلکہ ایک لحاظ سے زیادہ تھا۔ چونکہ اموی خاندان پر واقعہ کربلا کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس لئے امویوں کو ظالم ترین تصور کیا جاتا ہے۔ عباسیوں نے جتنا ظلم علویوں پر کیا ہے وہ بھی اپنی جگہ پر بہت زیادہ تھا۔ دوسرے عباسی خلیفہ نے شروع شروع میں اولاد امام حسینؑ پر بیعت کے بہانے سے حد سے زیادہ مظالم کئے۔ بہت سے سادات کو چن چن کر قتل کیا گیا اور کچھ زندانوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ ان بیچاروں کو کھانے پینے کیلئے نہیں دیا جاتا تھا۔ بعض سادات پر چھتیں گرا کر ان کو شہید کیا جاتا تھا۔ وہ کونسا ظلم تھا جو عباسیوں نے سادات پر نہ ڈھایا ہو۔ منصور کے بعد جو بھی خلیفہ آیا اس نے اسی پالیسی پر عمل کیا۔ مامون کے دور میں پانچ چھ سیّد زادوں نے انقلابی تحریکیں شروع کیں۔ ان کو مسعودی نے مروج الذہب اور ابن اثیر نے الکامل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تاریخ کی بعض کتب میں تو سات آٹھ انقلابی شہزادوں کا ذکر ملتا ہے۔

عباسیوں اور علویوں کے درمیان دشمنی بغض و کینہ کی حد تک چلی گئی تھی۔ کرسئ خلافت کے حصول کیلئے عباسیوں نے ظلم کی انتہا کر دی۔ یہاں تک کہ اگر عباسی خاندان کا کوئی فرد عباسی خلافت کا مخالف ہو جاتا تو اس کو بھی فوراً قتل کر دیا جاتا۔ ابو مسلم عمر بھر عباسیوں کے ساتھ وفاداریوں کا حق نبھاتا رہا لیکن جونہی اس کے بارے میں خطرے کا احساس کیا تو اسی وقت اس کا کام تمام کر دیا۔ برمکی خاندان نے ہارون کے ساتھ وفا کی انتہا کر دی تھی۔ انہوں نے اس کی خاطر غلط سے غلط کام بھی کئے اور ان دونوں خاندانوں کی دوستی تاریخ میں ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے، لیکن ایک چھوٹے سے سیاسی مسئلہ کی وجہ سے اس نے یحییٰ برمکی کو مروا دیا اور اس کے خاندان کو چین سے رہنے نہ دیا تھا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا یہی مامون اپنے بھائی امین کے ساتھ الجھ پڑا۔ سیاسی اختلاف اتنا بڑھا کہ نوبت لڑائی تک پہنچ گئی۔ بالآخر مامون کامیاب ہو گیا اور اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا۔ بدلتا رنگ ہے آسماں کیسے کیسے۔

پھر حالات نے رخ بدلا۔ ایک بہت بڑی تبدیلی آئی۔ ایسی تبدیلی کہ جس پر مورخین بھی حیران ہیں۔ خلیفہ مامون الرشید حضرت امام رضا علیہ السلام کو مدینہ سے بلواتا ہے اور حضرتؑ کے نام پیغام بھجواتا ہے کہ آپؑ خلافت مجھ سے لے لیں۔ جب آپؑ تشریف لاتے ہیں تو کہتا ہے کہ بہتر ہے آپؑ ولی عہدی ہی قبول فرمائیں۔ اگر نہ کیا تو آپؑ کے ساتھ یہ یہ سلوک کیا جائے گا۔ معاملہ دھمکیوں تک جا پہنچا۔ یہ مسئلہ اتنا سادہ اور آسان نہیں ہے کہ جس کو آسانی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ بہت ہی مشکل حالات تھے۔ امام علیہ السلام ہی بہتر جانتے تھے کہ کونسی حکمت عملی اپنائی جائے۔

جرجی زیدان ''تاریخ وتمدن'' کی چوتھی جلد میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ اس کے بارے میں، میں بھی تفصیلی بات چیت کروں گا۔ جرجی زیدان ایک بات کا اعتراف ضرور کرتا ہے کہ بنی عباس کی سیاست بھی انتہائی منافقانہ اور خفیہ طرز کی تھی۔ وہ اپنے قریبی ترین عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی سیاسی داؤ پیچ پوشیدہ رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر آج تک اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ مامون امام رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد بنا کر کیا حاصل کرنا چاہتا تھا؟ کیا وجہ تھی کہ وہ آل محمد علیہم السلام کے ایک

ایسے فرد کو اپنا نائب مقرر کر رہا تھا کہ جو وقت کا امام بھی تھا اور یہ دل ہی دل میں خاندان رسالتؐ کے ساتھ سخت دشمنی رکھتا تھا؟

امام رضاؑ کی ولی عہدی اور تاریخی حقائق

حضرت امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کا مسئلہ راز رہے یا نہ رہے، لیکن ملت جعفریہ کے نزدیک اس مسئلے کی حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے۔ ہمارے اس موقف کی صداقت کیلئے شیعہ مؤرخین کی روایات ہی کافی ہیں جیسا کہ جناب شیخ مفیدؒ نے اپنی کتاب الارشاد اور جناب شیخ صدوقؒ نے اپنی کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں نقل کیا ہے۔ خاص طور پر عیون میں امام رضا علیہ السلام ہی کی ولی عہدی کے بارے میں متعدد روایات نقل کی گئی ہیں۔

قبل اس کے ہم شیعہ کتب سے کچھ مطالب بیان کریں، اہل سنت مؤرخ ابوالفرج اصفہانی کی کتاب مقاتل الطالبین سے دلچسپ تاریخی نکات نقل کرتے ہیں۔ ابوالفرج اپنے عہد کا بہت بڑا مؤرخ ہے۔ یہ اموی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے یہ آل بابویہ کے زمانے میں زندگی بسر کرتا رہا۔ چونکہ یہ اصفہان کا رہنے والا ہے اس لئے اس کو اصفہانی کہا جاتا ہے۔ ابوالفرج سنی المذہب ہے۔ شیعوں سے اس کا کسی قسم کا تعلق نہیں ہے اور نہ ہی اس کو شیعوں سے کسی قسم کی ہمدردی تھی۔ پھر یہ شخص کچھ اتنا زیادہ نیک بھی نہ تھا کہ کہیں کہ اس نے تقویٰ اور پرہیزگاری کو سامنے رکھتے ہوئے حقائق کو بیان کیا ہو۔ مشہور کتاب الاغانی کا مصنف بھی یہی ابوالفرج اصفہانی ہی ہے۔ الاغانی ''اغنیۃ'' کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے آوازیں۔ اس کتاب میں موسیقی کا مکمل تعارف، کوائف اور تاریخ، تحقیقی انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اٹھارہ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب موسیقی کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالفرج کا ایک ہم عصر عالم صاحب بن عباد سفر پر کہیں بھی جاتا تھا تو ابوالفرج کی چند کتابیں اس کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ابوالفرج کی کتابوں کے ہوتے ہوئے اب مجھے دوسری کتابوں کی ضرورت نہ رہی۔ الاغانی اس قدر جامع اور تحقیقی کتاب ہے کہ اس کو پڑھ کر کسی دوسری کتاب کی احتیاج نہیں رہتی۔ یہ موضوع کے اعتبار سے منفرد کتاب ہے۔ اس میں موسیقی اور موسیقاروں کے بارے میں پوری وضاحت کے ساتھ گفتگو کی

گئی ہے۔علامہ مجلسیؒ اور شیخ عباس قمیؒ نے بھی الاغانی کو ابوالفرج کی تصنیف قرار دیا ہے۔

ہم نے کہا ہے کہ ابوالفرج کی ایک کتاب مقاتل الطالبین ہے (جو کہ کافی مشہور ہے) اس میں انہوں نے اولاد ابی طالب کے مقتولوں کی تاریخ بیان کی ہے۔اس میں اولاد ابی طالب کی انقلابی تحریکوں اوران کی المناک شہادتوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ مختلف تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شہادت کے اس باب میں علوی سادات کی اکثریت ہے۔ البتہ کچھ غیر علوی بھی شہید ہوئے ہیں۔ اس نے کتاب کے دس صفحے حضرت امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کے ساتھ مخصوص کئے ہیں۔اس کتاب کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کے مطالب اور شیعہ قلمکاروں کی تحریریں اس موضوع کی بابت تقریباً ایک جیسی ہیں۔ آپ الارشاد کا مطالعہ کرلیں اور مقاتل الطالبین کو پڑھ لیں، ان دونوں کتابوں میں آپ کو کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوگا۔

اس لئے ہم شیعہ سنی حوالوں سے اس مسئلہ پر بحث کریں گے،لیکن اس سے قبل ہم آتے ہیں مامون کی طرف کہ وہ کونسا عامل تھا کہ جس کی وجہ سے وہ حضرت امام رضا علیہ السلام کو ولی عہدی دینے پر تیار ہوا؟ اگر تو اس نے یہ سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ مرجائے یا قتل ہوجائے تو جانے سے پہلے خلافت حضرت امام رضا علیہ السلام کے سپرد کر جائے تو ہم اس کو اس لئے نہیں مانیں گے کہ اگر اس کی امام علیہ السلام کے بارے میں اچھی نیت ہوتی تو وہ ان کو زہر دے کر شہید نہ کرتا۔شیعوں کے نزدیک اس قول کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ مامون امام علیہ السلام کے بارے میں اچھی نیت رکھتا تھا۔بعض مؤرخین نے مامون کو شیعہ کے طور پر تسلیم کیا ہے کہ وہ آل علی علیہ السلام کا بیحد احترام کرتا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ واقعی ہی مخلص و مومن تھا تو اپنی خلافت سے دستبردار ہوکر اس نے مسند خلافت امام علیہ السلام کے سپرد کیوں نہ کردی؟ اگر وہ سادات کا محب تھا تو امام علیہ السلام کو زہر کیوں دیا؟

مامون اور تشیع

مامون ایک ایسا حکمران ہے کہ جس کو ہم خلفاء سے بڑھ کر بلکہ پوری دنیا کے حکمرانوں سے بڑھ کر عالم و دانشور مانتے ہیں۔ وہ اپنے دور کا نابغہ انسان تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ وہ فکری و نظریاتی لحاظ

سے مذہب شیعہ سے زیادہ متاثر تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ امام علیہ السلام کے علمی دروس میں باقاعدگی کے ساتھ شرکت کرتا تھا۔ وہ سنی علماء کے دروس میں بھی جاتا تھا۔ اہل سنت کے ایک معروف عالم ابن عبدالبر بیان کرتے ہیں کہ ایک روز مامون نے چالیس سنی علماء کو ناشتے پر بلایا اور ان کو بحث ومباحثہ کی بھی دعوت دی۔ آقائے محمد تقی شریعتی نے اپنی کتاب خلافت وولایت میں نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس خوبصورتی کے ساتھ مامون نے مسئلہ خلافت پر دلائل دیئے ہیں اتنے کسی اور عالم نے نہیں دیئے ہوں گے۔ ماموں نے علماء کے ساتھ خلافت امیر المومنینؑ پر بحث ومباحثہ کیا اور سب کو مغلوب کر دیا۔

شیعہ روایات میں آیا ہے اور جناب شیخ عباس قمیؒ نے بھی اپنی کتاب منتہی الآمال میں لکھا ہے کہ کسی نے مامون سے پوچھا کہ آپ نے شیعہ تعلیمات کس سے حاصل کی ہیں؟ کہنے لگا اپنے والد ہارون سے۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ ہارون بھی مذہب شیعہ کو اچھا اور برحق مذہب سمجھتا تھا۔ وہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ ایک خاص قسم کی عقیدت رکھتا تھا۔ مامون کا کہنا تھا کہ میں اپنے بابا سے کہا کرتا تھا کہ ایک طرف آپ امام علیہ السلام سے محبت کا دم بھرتے ہیں اور دوسری طرف ان کو روحانی وجسمانی اذیتیں بھی دیتے ہیں؟ تو وہ کہا کرتا تھا "الملک عقیم" یعنی ''اقتدار بیٹے کو بھی نہیں پہچانتا'' تو اگرچہ میرا بیٹا ہے لیکن میں یہ ہرگز برداشت نہ کروں گا کہ تو میری حکومت کے خلاف ذرا بھر اقدام کرے۔ حکومت، کرسی اور اقتدار کی خاطر میں تیرا سر قلم کر سکتا ہوں۔ مامون الرشید آئمہ طاہرینؑ کا دشمن تھا اس لئے اس کو شیعہ کہنا زیادتی ہو گی۔ یا پھر وہ کوفہ والوں کی مانند بے وفا تھا جو امام حسین علیہ السلام کو دعوت دے کر اپنا عہد توڑ بیٹھے اور یزیدی قوتوں کے ساتھ مل گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مامون عالم تھا لیکن اس علم کا کیا فائدہ جو اسے استاد کی تعظیم کا درس بھی نہ دے۔ کچھ مؤرخین کا کہنا ہے کہ مامون نے خلوص نیت سے امام رضا علیہ السلام کو حکومت کی دعوت دی تھی اور امام علیہ السلام کی موت طبعی تھی، لیکن ہم شیعہ اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے۔ مصلحت وقت کے مطابق آپؑ نے ولی عہدی کو قبول فرمایا تھا۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ امام علیہ السلام مامون کی حکومت کو حق مانتے اور جانتے ہوں۔ امام علیہ السلام ایک روز بھی مسند حکومت پر نہیں بیٹھے۔ جونہی وقت ملا آپؑ علوم اسلامی کی ترویج

کرتے، غریبوں اور بے نواؤں کی خدمت کرتے۔ رہی بات مامون کی تو حکومت اور اقتدار کے بھوکے یہ حکمران کسی سے مخلص نہ تھے۔ انہوں نے سیاسی مفادات کی خاطر بڑے بڑے مخلص دوستوں کو قتل کروا دیا تھا یہاں تک کہ اپنی اولاد پر بھی اعتبار نہ کیا۔

شیخ مفیدؒ و شیخ صدوقؒ کی آراء

ایک اور مفروضہ کہ جسے جناب شیخ مفیدؒ اور جناب شیخ صدوقؒ نے تسلیم کیا ہے، یہ ہے کہ مامون شروع میں امام رضا علیہ السلام کو اپنا نائب بنانے میں مخلص تھا، لیکن بعد میں اس کی نیت بدل گئی۔ ابوالفرج، جناب صدوقؒ اور شیخ مفیدؒ نے اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے:

مامون کہتا ہے: ایک روز مجھے اپنے بھائی امین نے بلوایا (مامون اس وقت امین کا ولی عہد تھا) لیکن میں نہ گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد اس کے سپاہی آئے کہ میرے ہاتھ باندھ کر مجھے خلیفہ امین کے پاس لے جائیں۔ خراسان کے نواحی علاقوں میں بہت سی انقلابی تحریکیں سر اٹھا رہی تھیں۔ میں نے اپنے سپاہیوں کو بھیجا کہ ان کے ساتھ مقابلہ کریں، لیکن ہمیں اس لڑائی میں شکست ہوئی۔ اس وقت میں نے تسلیم کر لیا کہ میں اپنے بھائی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک دن میں نے خدا سے توبہ کی۔ مامون نے جس شخص کو یہ بات بتائی وہ اس کو اس کمرے میں لے گیا اس کمرے کو دھلوایا پاک و پاکیزہ لباس پہنا اور اللہ تعالیٰ سے منت مانی کہ اگر میں تندرست ہو گیا تو خلافت اس شخص کو دے دوں گا جس کا وہ حقدار ہے۔ اسی جگہ پر جتنا مجھے قرآن مجید یاد تھا میں نے پڑھا اور چار رکعتیں ادا کیں۔ یہ کام میں نے انتہائی خلوص کے ساتھ کیا۔ اس عمل کے بعد میں نے اپنے اندر انہونی سی طاقت محسوس کی۔ اس کے بعد میں نے کبھی بھی کسی محاذ پر شکست نہیں کھائی۔ سیستان کے محاذ پر میں نے اپنی فوج بھیجی، وہاں سے فتح و کامیابی کی خبر ملی۔ پھر طاہر بن حسین کو اپنے بھائی کے مقابلہ میں بھیجا وہ بھی کامیاب ہوا۔ مسلسل کامیابیوں کے بعد میں اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا چاہتا تھا۔ شیخ صدوق اور دیگر شیعہ مؤرخین و محدثین نے اس امر کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ مامون نے نذر مانی تھی اس لئے اس نے امام رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا اس کی اور وجہ کوئی نہیں ہے ایک احتمال تو یہ تھا۔

دوسرا احتمال

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اقدام یا یہ سوچ مامون کی طرف سے نہ تھی بلکہ یہ منصوبہ فضل بن سہل[1] نے بنایا تھا۔ اس کے پاس دو عہدوں کا اختیار تھا۔ ایک تو وہ مامون کا وزیر تھا اور دوسرے وہ فوج کا سربراہ بھی تھا۔ اسی لئے اسے ''ذوالریاستین'' کہا جاتا تھا۔ فضل نے مامون سے کہا: آپ نے اب تک آل علیؑ پر بے تحاشا مظالم کئے ہیں۔ اب بہتر یہ ہے کہ اولاد علیؑ میں اس وقت سب سے افضل شخص حضرت امام رضا علیہ السلام موجود ہیں ان کو لے آئیں اور اپنے ولی عہد کے طور پر ان کو متعارف کروائیں۔ مامون دلی طور پر اس پر راضی نہ تھا۔ چونکہ وہ فضل کی بات کو ٹال نہ سکتا تھا اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت امام رضا علیہ السلام کا ولی عہد نامزد کرنا فضل بن سہل کی ایما پر ہوا۔

اس احتمال پر بھی ہم یہ کہیں گے کہ اگر اس ولی عہدی کے پیچھے فضل تھا تو اس نے یہ کام کیوں کیا؟ کیا فضل شیعہ تھا اور حضرت امام رضا علیہ السلام سے عقیدت رکھتا تھا؟ یا وہ پرانے مجوسانہ عقائد پر باقی تھا وہ چاہتا تھا کہ خلافت کو بنوعباس سے چھین لے۔ اس کا اصل مقصد خلافت سے کھیلنا تھا؟ اس صورت میں تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ حضرت امام رضا علیہ السلام کا ہرگز مخلص نہ تھا بلکہ ان کا بدخواہ تھا۔ پس اگر یہ اصل میں فضل کا منصوبہ تھا تو وہ مامون سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا تھا، کیونکہ مامون جیسا بھی تھا کم از کم مسلمان تو تھا۔

---

[1] مامون الرشید کے ایک وزیر کا نام فضل بن سہل تھا یہ دو بھائی تھے۔ دوسرے کا نام حسن بن سہل تھا۔ یہ دونوں خالصتاً ایرانی اور مجوسی الاصل تھے۔ برمکیوں کے دور میں فضل تعلیم یافتہ اور تجربہ کار سیاستدان کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ علم نجوم میں خاصی دسترس رکھتا تھا۔ یہ برمکیوں کے پاس آکر مسلمان ہوگیا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کے باپ نے اسلام قبول کیا اور بعض نے لکھا ہے کہ باپ مجوسی ہی تھا اور خود ان لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد فضل نے ترقی کی اور کچھ عرصے بعد ہی اسے بہت بڑی وزارت کا قلمدان مل گیا۔ گویا وزیر اعظم نامزد ہوگیا۔ اس وقت دوسرے شعبوں میں وزیر نہ ہوا کرتے تھے۔ سب کچھ فضل ہی کے پاس تھا۔ مامون کی فوج کی اکثریت ایرانی تھے۔ عرب فوج نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ چونکہ مامون خراسان میں تھا اور امین عرب میں تھا اور ان دونوں کے درمیان جنگ جاری رہتی تھی۔ عرب امین کو پسند کرتے تھے اور مامون خراسان میں رہنے کی وجہ سے ایرانیوں کو پسند تھا۔ مسعودی نے مروج الذہب میں اور التنبیہ والاشراف میں لکھا ہے کہ مامون کی ماں ایرانی تھی۔ اس لئے ایرانی قوم اس کو پسند کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ حکومت کے تمام تر اختیارات فضل کے پاس منتقل ہو گئے اور مامون محض ایک آلہ کار کے طور پر رہ گیا تھا۔

مگر یہ لوگ ایران کو دنیائے اسلام کی فہرست سے نکال کر مجوسیت میں لے جانا چاہتے تھے۔

بہرکیف وہ سوالات ہیں جو مختلف حوالوں سے مختلف افراد کی طرف سے اٹھائے گئے ہیں۔ میں یہ کبھی نہیں یہ کہوں گا کہ تاریخ کے پاس ان سوالات کا کوئی حتمی ہے یا نہیں ہے۔

جرجی زیدان کا اظہار خیال

ممتاز مؤرخ جرجی زیدان، فضل بن سہل کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام کو ولی عہد بنانا فضل ہی کا کارنامہ ہے۔ چونکہ فضل ایک شیعہ تھا اس لئے اس کی حضرت امام رضا علیہ السلام سے محبت ایک فطری امر تھا۔

مگر ہم جرجی کے اس نظریے کی اس لئے تردید کرتے ہیں کہ یہ بات تواریخ کی کتب میں ثابت نہیں ہوسکی۔ روایات میں ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام فضل کے سخت مخالف تھے۔ آپؑ مامون سے بڑھ کر فضل کی مخالفت کیا کرتے تھے، بلکہ اس کو مسلمانوں کیلئے بہت بڑا خطرہ محسوس کرتے تھے۔ کبھی کبھار آپؑ مامون کو فضل سے خبردار کیا کرتے تھے۔ فضل اور اس کا بھائی در پردہ امام رضا علیہ السلام کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔

پس یہاں پر دو احتمال ہمارے سامنے آتے ہیں:

ایک یہ کہ ولی عہدی کا منصوبہ مامون کا ذاتی اقدام تھا اور مامون اپنی منت کو پورا کرتے ہوئے امام رضا علیہ السلام کو خلافت دینا چاہتا تھا مگر اس کے بعد اس نے یہ ارادہ ترک کر کے انہیں ولی عہد بنانے کا پروگرام بنالیا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں شیخ صدوقؒ اور ہمارے کچھ دوسرے علماء نے اس نظریہ کو تسلیم کیا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ سارا منصوبہ فضل بن سہل کا تیار کردہ تھا اور بقول بعض مؤرخین فضل ایک مخلص ترین شیعہ تھا اور اس نے امامؑ کی محبت میں یہ کام کیا، جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ نہیں، اس کا یہ اقدام بدنیتی پر مبنی تھا۔

تیسرا احتمال

تیسرے احتمال کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اس اقدام پیچھے نیک نیتی اور اخلاص ہرگز نہ تھا، بلکہ اس کے پیچھے درج ذیل وجوہ میں سے کوئی وجہ کارفرما تھی:

الف۔شاید ایرانیوں کو خوش کرنا مقصود ہو:

ولی عہدی کا اقدام درحقیقت مامون کا اپنا ہی تھا۔ مامون شروع ہی سے مخلص نہ تھا۔ وہ سب کچھ سیاست اور سازش کے طور پر کر رہا تھا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ چونکہ ایرانی قوم شیعہ تھی اور امام علیہ السلام اور آل محمد علیہم السلام سے دلی عقیدت رکھتے تھی، اس لئے مامون نے ایرانیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے یہ قدم اٹھایا۔ جس روز مامون نے حضرت رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اس دن اس نے اعلان کیا کہ امام علیہ السلام کو ''رضا'' [1] کے لقب سے یاد کیا جائے تا کہ ایرانیوں نے نوے سال قبل "الرضا من آل محمدؐ" کے نام سے جو انقلابی تحریک شروع کی تھی اس کی یاد تازہ ہو جائے۔ مامون اپنے اس اقدام سے ایرانیوں کے دلوں میں اپنی قدر و منزلت میں اضافہ کرنا چاہتا تھا کہ میں وہ ہوں جس نے تمہاری اتی نوے سالہ تحریک کا احیاء کیا ہے۔ دراصل اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ ایرانیوں کو راضی کرلوں، امام رضا علیہ السلام کے بارے میں بعد میں سوچ لوں گا۔ نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چونکہ مامون اٹھائیس (۲۸) سالہ نوجوان تھا اور حضرتؑ کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی، (شیخ صدوقؒ کے مطابق اس وقت حضرتؑ کا سن مبارک ۴۷ سال تھا اور شاید یہی قول معتبر ہو) اس لئے مامون نے سوچا ہوگا کہ ظاہری طور پر امامؑ کی ولی عہدی میرے لئے نقصان دہ نہیں ہے، کیونکہ امام علیہ السلام بیس سال مجھ سے بڑے ہیں۔ یہ چند سال اور زندہ رہیں گے اور مجھ سے پہلے انتقال کر جائیں گے۔ چنانچہ مامون کی سیاسی چال تھی کہ امام علیہ السلام کو ولی عہد مقرر کر کے ایرانیوں کی ہمدردیاں حاصل کرے۔

---

[1] واضح رہے کہ بعض تاریخی حوالوں میں آیا ہے کہ امام علیہ السلام کو ''رضا'' کا لقب مامون نے دیا ہے۔ مگر ہماری احادیث اس کی تردید کرتی ہیں۔

ب۔علویوں کی انقلابی تحریک کو خاموش کرنا:

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مامون نے یہ اقدام علویوں کو خاموش کرنے کیلئے کیا ہے۔علوی اس وقت بہت زیادہ انقلابی سرگرمیوں میں مصروف تھے اور اس حوالے سے ان کو ملک بھر میں ایک خاص شہرت حاصل تھی۔سال میں چند مرتبہ ملک کے کسی کونے یا گوشے میں وہ حکومت کے خلاف تحریک شروع کرتے تھے۔مامون کو علویوں کو راضی کرنے کیلئے یہ اقدام کرنا پڑا۔اس کو یقین تھا جب وہ آل محمد علیہم السلام میں سے کسی محترم فرد کو اپنی حکومت میں شامل کر لے گا ایک تو عوامی ردعمل میں کمی واقع ہو جائے گی دوسرا وہ اس سے علویوں کو راضی کر لے گا یا لوگوں کے سامنے ان کے قیام کو بے وقعت کر دے گا۔ چنانچہ جب وہ امام رضا علیہ السلام کو اپنے قریب لے آیا تو اس نے بہت سے انقلابیوں کو معاف کر دیا۔اس نے امام رضا علیہ السلام کے بھائی کو بھی بخش دیا۔جس کی وجہ سے ایک لحاظ سے فضا خوشگوار ہوگئی۔دراصل یہ اس کی شاطرانہ چال تھی کہ خلافت یا دوستی کا حوالہ دے کر تمام انقلابی تحریکوں اور مسلح تنظیموں کو خاموش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔پھر موقع پا کر ایک ایک کر کے انقلابیوں کو ٹھکانے لگا دے گا۔اب علوی سادات بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔اگر کسی قسم کا قدم اٹھاتے تو لوگوں نے کہنا تھا کہ اب وہ اپنے بزرگ اور آقا امام رضا علیہ السلام کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

ج۔امام رضا علیہ السلام کو بے بس کرنا:

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مامون امام رضا علیہ السلام کو ولی عہد بنا کر سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتا تھا۔وہ اپنے اس اقدام سے امام رضا علیہ السلام کو بے بس کرنا چاہتا تھا۔ہماری روایات میں ہے کہ ایک روز حضرت امام رضا علیہ السلام نے مامون سے فرمایا کہ تمہارا مقصد کیا ہے؟ جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ جب کوئی فرد منفی سوچ رکھتا ہو اور حکومت وقت پر تنقید کرتا ہو تو وہ خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس وقت بھی اقوام عالم کا یہی حال ہے۔سب سے پہلے تو حکومتیں قوم کو بے بس اور نہتا کرتی ہیں۔جب ان سے ہر قسم کا اسلحہ واپس لے لیا جاتا ہے تو وہ ناکارہ ہو جاتی ہیں جس پر ظلم کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے مخالفوں کو مکمل طور پر کچل دیتی ہیں۔اُس دور میں عوام کا رخ آل علیؑ کی طرف تھا۔لوگوں کی دلی خواہش تھی کہ

امام رضا علیہ السلام مضب خلافت پر بیٹھیں اور اس غیر آباد دنیا کو آباد کر دیں۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہو اور عدل وانصاف کی حکمرانی ہو۔ ظلم کی اندھیری رات چھٹ جائے اور عدل کا سویرا ہو۔

مگر مامون نے امام علیہ السلام کو ولی عہد بنا کر لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ حکومت کے ہاتھ مضبوط ہیں۔ امام علیہ السلام بھی حکومت کے ساتھ ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے امام علیہ السلام کو بے اثر کرنا چاہتا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ امام علیہ السلام حکومت میں شامل ہو جائیں اور اپنا ذاتی اثر رسوخ کھو بیٹھیں۔

اب تاریخ کیلئے یہ بھی بہت بڑا مسئلہ ہے کہ وہ اس نتیجہ تک پہنچ سکے کہ ولی عہدی کا مسئلہ مامون کا ایجاد کردہ ہے یا فضل کا کوئی منصوبہ تھا؟ پھر اگر فضل کا منصوبہ تھا تو اس کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے؟ اگر یہ اقدام مامون کا تھا تو کیا وہ نیک نیتی پر مبنی تھا؟ اگر اس کی نیت صحیح تھی تو کیا وہ اپنے موقف پر قائم رہا؟ اگر وہ حسن نیت رکھتا تھا تو اس کی سیاست کیا تھی؟ تاریخ ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ شیخ صدوقؒ کا موقف تو یہ ہے مامون کی نیت شروع میں تو ٹھیک تھی لیکن بعد میں اس کا ارادہ بدل گیا۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ لوگ جب پریشانی ومشکل سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ حق کی طرف لوٹ آتے ہیں اور اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں، لیکن جب وہ مشکل سے نجات حاصل کر لیتے ہیں تو اپنے کئے ہوئے وعدوں کو بھول جاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ﴾

پس جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو نہایت خلوص سے اس کی عبادت کرنے والے بن کر خدا سے دُعا کرتے ہیں اور پھر جب اللہ انہیں خشکی میں (پہنچا کر) نجات دیتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے ہیں۔[1]

مامون کو جب مشکلات نے گھیرا تو اس نے یہ منت مان لی تھی لیکن جب وہ مشکلات سے نکل آیا تو سب کچھ بھول گیا۔

---

[1] سورۂ عنکبوت، آیت ۶۵۔

بہتر یہ ہے کہ ہم حضرت امام رضا علیہ السلام کے بارے میں تحقیق کریں اور تاریخ کے مسلمہ نکات پر نظر دوڑائیں تو حقیقت کھل کر عیاں ہو جائے گی۔ میرے خیال میں اس تحقیق سے مامون کی نیتیں اور منصوبے بھی کھل کر واضح ہو جائیں گے۔

تاریخی مسلمات

ا۔ مدینہ سے امام علیہ السلام کی خراسان میں آمد:

تاریخ نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام کو مدینہ سے خراسان (مرو) بلوانے پر آپؑ سے مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ گویا آپؑ اپنی مرضی سے نہیں آئے تھے بلکہ لائے گئے تھے۔ مؤرخین میں سے ایک نے بھی یہ نہیں لکھا کہ امام علیہ السلام کو خراسان لانے سے قبل کوئی خط و کتابت کی گئی ہو یا کسی شخص کے ذریعہ آپؑ تک پیغام بھجوایا گیا ہو۔ آپؑ کو طلب کئے جانے کا مقصد بالکل نہیں بتایا گیا تھا۔ جب آپؑ "مرو" میں تشریف لائے تو پہلی بار مسئلہ ولی عہدی پیش کیا گیا۔ امام علیہ السلام سمیت آل ابی طالبؑ پر حکومتی اہلکاروں کی اتنی کڑی نظر تھی کہ جس راستے سے امام علیہ السلام کو لایا گیا وہ راستہ بھی دوسرے راستوں سے مختلف تھا۔ پہلے ہی سے یہ پروگرام طے پایا تھا کہ امام علیہ السلام کو شیعہ نشین علاقوں سے نہ گزارا جائے، کیونکہ بغاوت کا خطرہ تھا۔ اس لئے مامون نے حکم دیا امام علیہ السلام کو کوفہ کے راستے سے نہ لایا جائے، بلکہ بصرہ اور خوزستان سے ہوتے ہوئے نیشاپور لایا جائے۔ پولیس اہلکاروں کی ایک بڑی تعداد حضرت امام رضا علیہ السلام کے ساتھ تھی اور ان میں بھی آپؑ کے دشمنوں اور مخالفوں کو تعینات کیا گیا۔ سب سے پہلے تو جو پولیس افسر آپؑ کی نگرانی کر رہا تھا وہ مامون کا خاص گماشتہ اور وفادار تھا۔ اس کا نام جلودی[1] تھا۔ یہ امام علیہ السلام سے بغض و عناد رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ جب مرو میں مسئلہ ولی عہدی پیش کیا گیا تو اس جلودی

---

[1] جلودی بہت ہی ملعون شخص تھا۔ اس نے مدینہ میں علویوں کے خلاف جنگ لڑی، لیکن اس کو شکست ہوئی۔ ہارون نے اسی جلودی کو حکم دیا تھا کہ آل ابی طالبؑ کا تمام مال، زیورات اور لباس وغیرہ لوٹ لے۔ یہ سادات کے دروازے پر آیا لیکن امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تجھے اندر نہیں جانے دوں گا۔ اس نے بہت اصرار کیا مگر امام علیہ السلام نے فرمایا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے کہا میری یہ ڈیوٹی میں شامل ہے۔ آپؑ نے فرمایا: تو ادھر ہی ٹھہر جا۔ جو کہتا ہے وہ ہم خود ہی تجھے دیتے ہیں۔ اس کے بعد حضرتؑ خود اندر تشریف لے گئے اور آپؑ نے خود بیبیوں سے کپڑے اور زیورات وغیرہ لے کر جلودی کے حوالے کر دیئے۔

نامی شخص نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مامون نے اسے خاموش رہنے کو کہا لیکن اس نے کہا کہ میں اس کی بھرپور مخالفت کروں گا۔ جلودی اور دو دوسرے آدمیوں کو زندان میں ڈالا گیا پھر اسی مخالفت اور دشمنی کی وجہ سے ان کو قتل کر دیا گیا جس کا واقعہ یوں ہوا کہ ایک روز ہارون نے حضرت امام علیہ السلام اور فضل کی موجودگی میں جلودی کو اپنے دربار میں بلوایا اور اس سے کہا کہ اپنے موقف پر نظر ثانی کرے، لیکن جلودی اور اس کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم سو فی صد اس بات کی مخالفت کریں گے بلکہ ایک شخص نے بدتمیزی بھی کی۔ ہارون نے حکم دیا ان میں سے جو بھی ہماری بات نہ مانے ان کا سر قلم کر دیا جائے۔ ان میں سے ایک شخص کی گردن اڑا دی گئی۔ دوسرے سے پوچھا گیا تو وہ اپنی بات پر بضد رہا تو اس کے گردن بھی ماردی گئی۔ اس کے بعد جلودی کی باری آئی۔ امام رضا علیہ السلام نے جو مامون کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے، اس کے کان میں کہا کہ اسے معاف کر دو، لیکن جلودی نے کہا: اے امیر! میری آپ سے ایک درخواست ہے وہ یہ کہ اس شخص یعنی امام علیہ السلام کی سفارش میرے بارے میں قبول نہ کیجئے۔ مامون نے کہا تیری قسمت ہی خراب ہے۔ ٹھیک میں امام علیہ السلام کی سفارش قبول نہیں کرتا۔ اس نے تلوار اٹھائی اور اسی وقت جلودی کو ڈھیر کر دیا۔

بہر حال امام رضا علیہ السلام کو خراسان لایا گیا۔ تمام سادات ایک جگہ پر اور امام رضا علیہ السلام ایک جگہ پر پولیس کے سخت پہروں میں تھے۔ اس وقت مامون نے کہا: آقا! میں آپؑ کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات تاریخ کی مسلمہ حقائق میں سے ہے۔

۲۔ امام رضا علیہ السلام کا انکار:

جیسا کہ ہم نے کہا کہ مدینہ میں حضرتؑ سے ولی عہدی کی بات بھی نہ کی گئی اور نہ اس سے متعلق کوئی مشورہ لیا گیا۔ "مرو" میں جب آپؑ کو ولی عہدی کی بابت بتایا گیا تو آپؑ نے سختی سے انکار کیا۔ ابوالفرج نے مقاتل الطالبین میں لکھا ہے کہ مامون نے فضل بن سہل اور حسن بن سہل کو امام علیہ السلام کے پاس بھیجا۔ جب ان دونوں بھائیوں نے آپؑ کی ولی عہدی کے بارے میں بتایا تو آپؑ نے فرمایا: ایسا نہیں ہوگا اور تم لوگ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم مجبور ہیں ہمیں اوپر سے حکم ہوا ہے کہ اگر آپؑ نے انکار کیا تو

آپؑ کا سر قلم کر دیں گے۔

شیعہ علماء نے بار بار اس تاریخی جملہ کو ذکر کیا ہے کہ انکار کی صورت میں آپؑ کو اسی وقت قتل کر دیا جاتا، لیکن مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرتؑ نے قبول نہ فرمایا۔ یہ دونوں مامون کے پاس گئے۔ دوسری مرتبہ مامون خود حضرتؑ کے پاس آیا اور بات چیت کی۔ آخر میں امام علیہ السلام کو قتل کی دھمکی بھی دی اور کہا کہ آپؑ اس عہدے کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ کیا آپؑ کے دادا علی علیہ السلام نے مجلس شوریٰ میں شرکت نہ کی تھی؟

اس سے وہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ چیز آپؑ کی خاندانی روایات کے خلاف بھی نہیں ہے۔ یعنی جب حضرت علی علیہ السلام نے شوریٰ میں شرکت فرمائی تو خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لیا گویا انہوں نے وقتی طور پر اپنی خلافتِ الٰہی کے حق سے دستبرداری اختیار کر لی تھی اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ مامون کہنا چاہتا تھا کہ جب آپؑ کے دادا علی علیہ السلام نے شوریٰ کے فیصلوں کو تسلیم کیا ہے تو آپؑ ہماری مشاورتی کمیٹی میں شمولیت اختیار کیوں نہیں کرتے؟ اس پر امام علیہ السلام نے مجبور ہو کر قبول کر لیا اور خاموش ہو گئے۔

البتہ اس سوال کا جواب باقی ہے جو کہ ہم نے اپنی اس گفتگو میں دینا ہے کہ جب امام علیہ السلام نے انکار کر دیا تھا تو اپنے اس موقف پر قائم رہتے، اگرچہ اس کیلئے آپؑ کو جان بھی قربان کرنی پڑتی تو کر لیتے؟ جیسا کہ امام حسین علیہ السلام نے یزید کی بیعت سے انکار کر کے اپنی مظلومانہ شہادت کو قبول کر لیا، لیکن یزیدیت کے سامنے اپنا سر نہ جھکایا۔ جب انکار ہی کیا تھا تو انکار ہی رہنے دیتے؟ اس سوال کا جواب ہم اس گفتگو میں دیں گے۔

۳۔ امام رضا علیہ السلام کی شرط:

مؤرخین نے لکھا ہے کہ امام علیہ السلام نے ایک شرط عائد کی کہ ولی عہدی کا منصب میں اس صورت میں قبول کروں گا کہ حکومتی اور سرکاری معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کروں گا اور کوئی ذمہ داری بھی نہ لوں گا۔ درحقیقت آپؑ مامون کے کسی کام میں تعاون نہیں کرنا چاہتے تھے۔ گویا آپؑ ایک طرح کی مامون

کی مخالفت کررہے تھے۔ یہ ایک طرح کا احتجاج تھا اور احتساب بھی۔ مامون نے امام علیہ السلام کی یہ شرط مان لی۔ چنانچہ امام علیہ السلام حکومت کی طرف سے منعقد کردہ نماز عید کے اجتماع بھی شرکت نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ مامون نے امام علیہ السلام سے کہا کہ آپؑ اس عید پر ضرور تشریف لائیں۔ آپؑ نے فرمایا: یہ میرے معاہدے کے خلاف ہے۔ مامون بولا: لوگ ہمارے خلاف طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ اس مرتبہ آپؑ ہر حالت میں شرکت فرمایئے۔ حضرتؑ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ آپؑ نے ایسی صورت میں مامون کی دعوت قبول فرمائی کہ مامون اور فضل کو شرمندگی اٹھانا پڑی، کیونکہ آپؑ کی وجہ سے ایک بہت بڑے انقلاب کے برپا ہونے کا خطرہ ہوگیا تھا۔ اسی خوف اور خدشے کی بنا پر آپؑ کو راستہ ہی میں واپس بھیج دیا گیا کیونکہ حکومت وقت کو یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ اگر آپؑ عید کے اجتماع میں شرکت کرتے ہیں تو لوگوں کا انبوہ کثیر آپؑ کی بیعت کر کے حکومت وقت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا۔

۴۔ ولی عہدی کے اعلان کے بعد امام علیہ السلام کا رویہ:

اس مسئلہ سے بھی اہم مسئلہ ولی عہدی کے اعلان کے بعد امام رضا علیہ السلام کا مامون کے ساتھ لاتعلقی پر مبنی رویہ اختیار کرنا ہے۔ اس کے بارے میں اہل سنت اور اہل تشیع کے علماء اور مؤرخین نے کھلے لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے۔ جب امام رضا علیہ السلام کو ولی عہد نامزد کیا جاچکا تو آپؑ نے ڈیڑھ سطر کا خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپؑ نے اپنی پالیسی کھل کر بیان کی۔ آپؑ نے اس خطبہ میں نہ مامون کا نام لیا اور اس کا معمولی سا بھی شکریہ ادا نہ کیا۔ حالانکہ سرکاری پروٹوکول کے مطابق آپؑ کو مامون کا نام لینے کے ساتھ ساتھ شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے تھا۔

ابوالفرج اصفہانی بیان کرتے ہیں کہ مامون نے ایک دن اعلان کیا کہ فلاں روز ملک بھر کے عوام ایک جگہ پر جمع ہوں اور علانیہ طور پر امام رضا علیہ السلام کی بیعت کی جائے۔ چنانچہ ایک بہت بڑا اجتماع ہوا۔ اس میں مامون نے امام علیہ السلام کیلئے کرسی صدارت بچھوائی۔ سب سے پہلے مامون کے بیٹے عباس نے بیعت کی۔ پھر ایک علوی سیّد کو بیعت کا موقع دیا گیا۔ اس طرح ایک عباسی اور ایک علوی بیعت کیلئے آتے جاتے رہے اور ان بیعت کرنے والوں کو بہترین انعامات بھی دیئے گئے۔ جب لوگ بیعت کرنے آ

رہے تھے تو آپؑ نے ایک خاص انداز سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جس پر ماموں نے کہا کہ آپؑ اپنا ہاتھ کھول کر رکھیں تا کہ لوگ بیعت کریں۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میرے جد بزرگوار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طریقے سے بیعت لیتے تھے۔ لوگوں نے آپؑ کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی۔ خطباء، شعراء اور مقررین نے اپنے اپنے الفاظ اور اپنے اپنے انداز میں سرکار امام رضا علیہ السلام کی مدح سرائی کی۔ بعض شعراء نے مامون کو بھی سراہا۔ اس کے بعد مامون نے امام رضا علیہ السلام سے کہا: **قُمْ فَاخْطُبِ النَّاسَ وَ تَكَلَّمْ فِيهِمْ:** ''آپؑ اٹھ کر لوگوں سے خطاب کریں اور ولی عہدی کے بارے میں گفتگو کریں''۔ مامون کو یہ توقع تھی کہ امام علیہ السلام اس کے حق میں توصیفی کلمات ادا فرمائیں گے۔ مگر امام علیہ السلام نے حمد و ثنا کے بعد محض ان الفاظ پر اکتفا کیا:

اِنَّ لَنَا عَلَيْكُمْ حَقًّا بِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ. وَلَكُمْ عَلَيْنَا حَقٌّ بِهٖ. فَاِذَا اَدَّيْتُمْ اِلَيْنَا ذٰلِكَ وَجَبَ عَلَيْنَا الْحَقُّ لَكُمْ۔

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے ہمارا تم پر ایک حق ہے اور تمہارا بھی ہم پر ایک حق ہے۔ اگر تم نے اپنا حق ادا کر دیا تو ہم بھی تمہارا حق ادا کرنے پابند ہوں گے۔[1]

(جاری ہے)

*****

[1] مسند امام رضاؑ، ص ۱۲۲۔

خصائص علوم اہل بیتؑ (۱)

قسط:19

از: آیت اللہ محمد محمدی ری شہری

ترجمہ: علامہ ذیشان حیدر جوادی

۱۔ پورے قرآن کا علم:

[1] اَبُوْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيُّ: سَئَلْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ عَنْ قَوْلِ اللهِ تَعَالٰى: ﴿وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾[1]. قَالَ: ذَاكَ اَخِيْ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ۔

ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے: میں نے حضرت رسول اکرم ﷺ سے آیت شریفہ (جس میں ارشاد ہے:) ''اور جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے'' کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: اس سے میرے بھائی علی بن ابی طالب علیہ السلام مراد ہیں۔[2]

[2] اَبُوْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيُّ: سَئَلْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ عَنْ قَوْلِ اللهِ جَلَّ شَانُهٗ: ﴿قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ﴾[3]. قَالَ: ذَاكَ وَصِيُّ اَخِيْ سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوٗدَ. فَقُلْتُ لَهٗ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! فَقَوْلُ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: ﴿قُلْ كَفٰى بِاللهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾؟[4]. قَالَ: ذَاكَ اَخِيْ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ۔

ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے: میں نے رسول اکرم ﷺ سے ارشاد خداوندی: ''اور جس کے پاس کتاب کا ایک حصہ علم تھا، اس نے کہا'' کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''یہ میرے بھائی سلیمان بن داود علیہما السلام کے وصی (آصف برخیا) تھے''۔ ابوسعیدؓ کہتے ہیں: پھر میں نے دریافت کیا آیہ مجیدہ: ''کہہ دیجئے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان رسالت کی گواہی کیلئے خدا کافی ہے اور وہ شخص کافی

---

[1] سورۂ رعد، آیت ۴۳۔

[2] شواہد التنزیل، ج ۱، ص ۴۰۰، حدیث ۴۲۲۔

[3] سورۂ نمل، آیت ۴۰۔

[4] سورۂ رعد، آیت ۴۳۔

ہے جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے'' کے مصداق کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا: یہ میرے بھائی علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔[1]

[3] اَلْاِمَامُ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ ۔ فِيْ قَوْلِ اللهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى: ﴿قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾۔: اَنَا هُوَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ۔

حضرت امام علی علیہ السلام نے آیت شریفہ ﴿وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾ کے ذیل میں فرمایا: میں وہ ہوں جس کے پاس کل کتاب کا علم ہے۔[2]

[4] اَلْاِمَامُ الْحُسَيْنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: نَحْنُ الَّذِيْنَ عِنْدَنَا عِلْمُ الْكِتَابِ وَبَيَانُ مَا فِيْهِ. وَلَيْسَ لِاَحَدٍ مِّنْ خَلْقِهٖ مَا عِنْدَنَا. لِاَنَّا اَهْلُ سِرِّ اللهِ۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: ہم وہ ہیں جن کے پاس کل کتاب کا علم اور اس کا بیان موجود ہے اور ہمارے علاوہ ساری مخلوقات میں کوئی ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم اسرار الٰہیہ کے امین ہیں۔[3]

[5] عَبْدُ اللهِ بْنُ عَطَاءٍ: كُنْتُ عِنْدَ اَبِيْ جَعْفَرٍ جَالِسًا اِذْ مَرَّ عَلَيْهِ ابْنُ عَبْدِاللهِ بْنِ سَلَامٍ. قُلْتُ: جَعَلَنِي اللهُ فِدَاكَ! هٰذَا ابْنُ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ؟ قَالَ: لَا. وَلٰكِنَّهٗ صَاحِبُكُمْ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ الَّذِيْ نَزَلَتْ فِيْهِ اٰيَاتٌ مِّنْ كِتَابِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: ﴿وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾۔

عبداللہ بن عطاء روایت کرتے ہیں: میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ ادھر سے عبداللہ بن سلام کے فرزند کا گزر ہوا۔ میں نے امامؑ کی خدمت عرض کی: آپؑ پر قربان! کیا یہ "الذی عندہ علم الکتاب" کے مصداق کا فرزند ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: ''ہرگز نہیں''، اس سے مراد حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں جن کے بارے میں بہت سی آیات نازل ہوئی ہیں۔[4]

[6] اَلْاِمَامُ الْبَاقِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ ۔ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى: ﴿قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾۔: اِيَّانَا عَنٰى. وَ عَلِيٌّ اَوَّلُنَا وَ اَفْضَلُنَا وَ خَيْرُنَا بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ

---

[1] سورۂ رعد، آیت ۴۳۔

[2] بصائر الدرجات، ص ۲۱۶، حدیث ۲۱۔

[3] مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، حدیث ۵۲۔

[4] مناقب ابن المغازلی، ص ۳۱۴، حدیث ۳۵۸۔ شواہد التنزیل، ج ۱، ص ۴۰۲، حدیث ۴۲۵۔ ینابیع المودۃ، ج ۱۱، ص ۳۰۵۔ العمدۃ، ص ۲۹۰، حدیث ۴۷۶۔ تفسیر عیاشی، ج ۲، ص ۲۲۰، حدیث ۷۷۔ مناقب ابن شہر آشوب، ج ۲، ص ۲۹۔

عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے آیت شریفہ ''قل کفٰی ۔۔۔'' کے ذیل میں فرمایا: اس سے مراد ہم اہلبیتؑ ہیں اور امام علی علیہ السلام ہمارے اوّل وافضل اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے بہتر ہیں۔[1]

[7] عَبدُ الرَّحمٰنِ بْنُ كَثِيْرٍ عَنِ الصَّادِقِ عَلَيْهِ السَّلَامُ ۔ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى: ﴿قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ﴾[2]: فَفَرَّجَ اَبُوْ عَبْدِ اللهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ فَوَضَعَهَا فِيْ صَدْرِهٖ. ثُمَّ قَالَ: وَ عِنْدَنَا وَاللهِ! عِلْمُ الْكِتَابِ كُلُّهٗ۔

عبدالرحمٰن بن کثیر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیت شریفہ جس میں ارشاد ہے: ''اور جس کے پاس کتاب کا ایک حصہ علم تھا اس نے کہا کہ میں اتنی جلدی اسے لے آؤں گا کہ آپؑ کی پلک بھی نہ جھپکنے پائے'' کے بارے میں دریافت کیا تو آپؑ نے اپنی مبارک انگلیوں کو کھول کر سینے پر رکھا اور فرمایا: اور خدا کی قسم! ہمارے پاس پوری کی پوری کتاب کا علم ہے۔[3]

[8] اَبُو الْحَسَنِ مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى الْفَارِسِيُّ: نَظَرَ اَبُوْ نُوَاسٍ اِلٰى اَبِي الْحَسَنِ عَلِيِّ بْنِ مُوْسَى الرِّضَا ذَاتَ يَوْمٍ وَ قَدْ خَرَجَ مِن عِنْدِ الْمَامُوْنِ عَلٰى بَغْلَةٍ لَهٗ. فَدَنَا مِنْهُ اَبُوْ نُوَاسٍ. فَسَلَّمَ عَلَيْهِ وَقَالَ: يَا بْنَ رَسُوْلِ اللهِ! قَدْ قُلْتُ فِيْكَ اَبْيَاتًا فَاُحِبُّ اَنْ تَسْمَعَهَا مِنِّيْ. قَالَ: هَاتِ. فَاَنْشَاَ يَقُوْلُ:

مُطَهَّرُوْنَ نَقِيَّاتٌ ثِيَابُهُمُ تَجْرِي الصَّلَاةُ عَلَيْهِمْ اَيْنَمَا ذُكِرُوْا
مَن لَّمْ يَكُنْ عَلَوِيًّا حِيْنَ تَنْسِبُهٗ فَمَا لَهٗ مِنْ قَدِيْمِ الدَّهْرِ مُفْتَخَرُ
فَاللهُ لَمَّا بَرَاَ خَلْقًا فَاَتْقَنَهٗ صَفَّاكُمُ وَاصْطَفَاكُمْ اَيُّهَا الْبَشَرُ
فَاَنْتُمُ الْمَلَاُ الْاَعْلٰى وَ عِنْدَكُمُ عِلْمُ الْكِتَابِ وَ مَا جَآءَتْ بِهِ السُّوَرُ

فَقَالَ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ: قَدْ جِئْتَنَا بِاَبْيَاتٍ مَّا سَبَقَكَ اِلَيْهَا اَحَدٌ۔

ابوالحسن محمد بن یحییٰ الفارسی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ابونواس نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو مامون کے یہاں سے سواری پر نکلتے دیکھا تو قریب جا کر سلام عرض کیا اور کہا کہ فرزند رسولؐ! میں نے آپؑ کی شان میں کچھ اشعار لکھے ہیں اور چاہتا ہوں کہ آپؑ سماعت فرمالیں۔ آپؑ نے فرمایا: سناؤ۔ اس پر

---

[1] الکافی، ج۱، ص۲۲۹، حدیث۶۔ تفسیر عیاشی، ج۲، ص۲۲۰، حدیث۶۷۔ بصائر الدرجات، ص۲۱۴، حدیث۷۔

[2] سورۂ نمل، آیت۴۰۔

[3] الکافی، ج۱، ص۲۲۹، حدیث۵، ص۲۵۷، حدیث۳۔ بصائر الدرجات، ص۲۱، حدیث۲۔

ابونواس نے یہ اشعار پیش کئے:

"اہلبیتؑ وہ افراد ہیں جن کا لباس کردار بالکل پاک وصاف ہے اور ان کا ذکر جہاں بھی آتا ہے صلوات کے ساتھ آتا ہے۔ جو شخص بھی علیؑ سے نسبت نہ رکھتا ہو اس کیلئے زمانہ میں کوئی شے باعث فخر نہیں ہے۔ اے اہلبیتؑ! اللہ نے جب مخلوقات کو خلق کیا ہے تو آپؑ کو منتخب اور برگزیدہ قرار دیا ہے۔ آپؑ ہی ملاء اعلیٰ ہو اور آپؑ ہی کے پاس پورے قرآن اور تمام سورتوں کے مضامین کا علم ہے"۔

یہ سن کر حضرتؑ نے فرمایا: "ہماری شان میں تم سے پہلے ایسے شعر کسی نے نہیں کہے ہیں"۔[1]

۲۔ تاویل قرآن کا علم:

[9] رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ: عَلِيٌّ يُعَلِّمُ النَّاسَ بَعْدِيْ مِنْ تَأْوِيْلِ الْقُرْاٰنِ مَا لَا يَعْلَمُوْنَ ـ اَوْ (قَالَ:) يُخْبِرُهُمْ۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: میرے بعد علیؑ ہی لوگوں کو تاویل قرآن کا علم دیں گے اور انہیں باخبر بنائیں گے۔[2]

[10] اَلْاِمَامُ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: سَلُوْنِيْ عَنْ كِتَابِ اللهِ. فَاِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اٰيَةٍ اِلَّا وَقَدْ عَرَفْتُ بِلَيْلٍ نَزَلَتْ اَمْ بِنَهَارٍ. فِيْ سَهْلٍ اَمْ فِيْ جَبَلٍ۔

حضرت امام علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے: مجھ سے کتاب الٰہی کے بارے میں جو چاہو دریافت کرلو کہ کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ دن میں نازل ہوئی ہے یا رات میں، صحرا میں نازل ہوئی ہے یا پہاڑ پر۔[3]

[11] عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: سَلُوْنِيْ عَنْ كِتَابِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ. فَوَاللهِ مَا نَزَلَتْ اٰيَةٌ مِنْهُ فِيْ لَيْلٍ اَوْ نَهَارٍ وَّ لَا مَسِيْرٍ وَّ لَا مُقَامٍ اِلَّا وَقَدْ اَقْرَاَنِيْهَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ وَعَلَّمَنِيْ تَأْوِيْلَهَا. فَقَالَ ابْنُ الْكَوَّآءِ: يَآ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! فَمَا كَانَ يَنْزِلُ عَلَيْهِ وَاَنْتَ غَائِبٌ عَنْهُ؟ قَالَ: كَانَ يَحْفَظُ عَلَيَّ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ مَا كَانَ يَنْزِلُ عَلَيْهِ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَاَنَا عَنْهُ غَآئِبٌ حَتّٰى اَقْدَمَ عَلَيْهِ فَيُقْرِئُنِيْهِ وَيَقُوْلُ لِيْ: يَا عَلِيُّ! اَنْزَلَ اللهُ عَلَيَّ بَعْدَكَ كَذَا وَكَذَا وَتَأْوِيْلُهٗ كَذَا

---

[1] عیون اخبار الرضاؑ، ج ۲، ص ۱۴۳، حدیث ۱۰۔ مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۳۶۶۔

[2] شواہد التنزیل، ج ۱، ص ۳۹، حدیث ۲۸۔

[3] الطبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۳۳۸۔ تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۸۔ تاریخ دمشق، حالات امام علیؑ، ج ۳، ص ۲۱، حدیث ۱۰۳۹۔ تفسیر عیاشی، ج ۲، ص ۳۸۳، حدیث ۳۱۔ امالی شیخ صدوقؒ، ص ۲۲۷، حدیث ۱۳۔ امالی شیخ مفیدؒ، ص ۱۵۲، حدیث ۳۔

وَكَذَا. فَيُعَلِّمُنِيْ تَنْزِيْلَهُ وَتَأْوِيْلَهُ۔

حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا: مجھ سے کتاب خدا کے بارے میں دریافت کرو، خدا کی قسم! دن یا رات میں، سفر یا حضر میں کوئی آیت ایسی نازل نہیں ہوئی جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے سنایا نہ ہو اور اس کی تاویل نہ بتائی ہو۔ یہ سن کر ابن الکواء بول پڑا: اے امیر المومنینؑ! اور وہ آیات جو آپؑ کی غیر موجودگی میں نازل ہوتی تھیں ان کے بارے میں کیا فرمائیں گے؟ آپؑ نے فرمایا: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں محفوظ رکھتے تھے یہاں تک کہ جب میں حاضر ہوتا تھا تو مجھے سنا دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے: یا علیؑ! اللہ نے تمہارے بعد یہ آیات نازل کی ہیں اور ان کی یہ تاویل ہے۔ اس طرح آپؐ مجھے تنزیل و تاویل دونوں سے باخبر فرما دیا کرتے تھے۔[1]

[12] عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَا نَزَلَتْ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ اٰيَةٌ مِّنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا اَقْرَاَنِيْهَا وَ اَمْلَاهَا عَلَيَّ فَكَتَبْتُهَا بِخَطِّيْ. وَ عَلَّمَنِيْ تَأْوِيْلَهَا وَ تَفْسِيْرَهَا. وَنَاسِخَهَا وَمَنْسُوْخَهَا. وَمُحْكَمَهَا وَمُتَشَابِهَهَا. وَخَاصَّهَا وَعَامَّهَا۔

حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی بھی آیت قرآن نازل نہیں ہوئی مگر یہ کہ آپؐ نے مجھے سنا بھی دی اور لکھوا بھی دی اور میں نے اپنے قلم سے اسے لکھ لیا اور پھر مجھے اس کی تاویل و تفسیر، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ اور خاص و عام سے بھی آگاہ فرما دیا۔[2]

[13] عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ: اِنَّ الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ. مَا مِنْهَا حَرْفٌ اِلَّا لَهٗ ظَهْرٌ وَ بَطْنٌ. وَاِنَّ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ عِنْدَهٗ عِلْمُ الظَّاهِرِ وَالْبَاطِنِ۔

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں: قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا ہے اور ہر حرف کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور علی بن ابی طالب علیہ السلام کے پاس ظاہر کا علم بھی ہے اور باطن کا بھی۔[3]

[14] اَلْاِمَامُ الْحَسَنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ ـ فِيْ مَجْلِسِ مُعَاوِيَةَ ـ: وَاَنَا ابْنُ خِيْرَةِ الْاِمَآءِ وَ سَيِّدَةِ النِّسَآءِ. غَذَّانَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ بِعِلْمِ اللهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى. فَعَلَّمَنَا تَأْوِيْلَ

---

[1] امالی شیخ طوسیؒ، ص ۵۲۳، حدیث ۱۱۵۸۔ الاحتجاج، ج ۱، ص ۶۱۷، حدیث ۱۴۰۔ کتاب سلیم بن قیس، ص ۲۱۴۔

[2] الکافی، ج ۱، ص ۶۴، حدیث ۱۔ کمال الدین، ص ۲۸۴، حدیث ۷۔ تفسیر عیاشی، ج ۱، ص ۲۵۳۔

[3] حلیۃ الاولیاء، ج ۱، ص ۶۵۔ تاریخ دمشق، ج ۳، ص ۲۵، حدیث ۱۰۴۸۔ ینابیع المودۃ، ج ۱، ص ۲۱۵، حدیث ۲۴۔

الْقُرْاٰنِ. وَمُشْكِلَاتِ الْاَحْكَامِ. لَنَا الْعِزَّةُ الْغَلَبَآءُ وَالْكَلِمَةُ الْعُلْيَآءُ. وَالْفَخْرُ وَالسَّنَآءُ۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے امیر شام کے دربار میں فرمایا: میں بہترین کنیز خدا اور خواتین عالم کی سردار کا فرزند ہوں۔ مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم خدا کی غذا دی ہے اور تاویل قرآن اور مشکل احکام سے باخبر کیا ہے۔ ہمارے لئے غالب آنے والی عزت، بلندترین کلمہ اور فخر و نورانیت ہے۔[1]

[15] اَلْاِمَامُ الْبَاقِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَا يَسْتَطِيْعُ اَحَدٌ اَنْ يَّدَّعِيَ اَنَّ عِنْدَهٗ جَمِيْعَ الْقُرْاٰنِ كُلَّهٗ ظَاهِرَهٗ وَبَاطِنَهٗ غَيْرَ الْاَوْصِيَآءِ۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے: کسی شخص کے بس میں نہیں ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ ہمارے پاس تمام قرآن کے ظاہر و باطن کا علم ہے، سوائے پیغمبر اسلام کے اوصیاء (اہلبیتؑ) کے۔[2]

[16] عَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَا ادَّعٰى اَحَدٌ مِّنَ النَّاسِ اَنَّهٗ جَمَعَ الْقُرْاٰنَ كُلَّهٗ كَمَآ اُنْزِلَ اِلَّا كَذَّابٌ. وَمَا جَمَعَهٗ وَحَفِظَهٗ كَمَا نَزَّلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَّا عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَالْاَئِمَّةُ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ مِنْ بَعْدِهٖ۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: جس شخص نے بھی یہ دعویٰ کیا کہ اس نے سارا قرآن تنزیل کے مطابق جمع کیا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ قرآن مجید کو تنزیل کے مطابق صرف حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے جمع کیا ہے اور ان کی اولاد کے آئمہ طاہرین علیہم السلام نے اسے محفوظ رکھا ہے۔[3]

[17] اَلْفُضَيْلُ بْنُ يَسَارٍ: سَئَلْتُ اَبَا جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنْ هٰذِهِ الرِّوَايَةِ: مَا فِي الْقُرْاٰنِ اٰيَةٌ اِلَّا وَلَهَا ظَهْرٌ وَّبَطْنٌ. وَمَا فِيْهِ حَرْفٌ اِلَّا وَلَهٗ حَدٌّ. وَلِكُلِّ حَدٍّ مُّطَّلَعٌ. مَا يَعْنِيْ بِقَوْلِهٖ: لَهَا ظَهْرٌ وَّبَطْنٌ؟ قَالَ: ظَهْرُهٗ وَبَطْنُهٗ تَاْوِيْلُهٗ. مِنْهُ مَا مَضٰى وَمِنْهُ مَا لَمْ يَكُنْ بَعْدُ. يَجْرِيْ كَمَا تَجْرِي الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ. كُلَّمَا جَآءَ مِنْهُ شَيْءٌ وَّقَعَ. قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾[4] (نَحْنُ نَعْلَمُهٗ)۔

---

[1] الاحتجاج، ج ۲، ص ۷۴۔

[2] الکافی، ج ۱، ص ۲۲۸، حدیث ۲۔ بصائر الدرجات، ص ۱۹۳۔

[3] الکافی، ج ۱، ص ۲۲۸، حدیث ۱۔

[4] سورۂ آل عمران، آیت ۷۔

فضیل بن یسار کا بیان ہے: میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس روایت: ''قرآن کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن بھی اور اس کے ہر حرف کی ایک حد ہے جس سے کوئی آگاہ ہے''۔ (مولا!) آخر اس ظاہر و باطن سے مراد کیا ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: اس سے مراد تاویل قرآن ہے جس کا ایک حصہ گزر چکا ہے اور ایک حصہ مستقبل میں پیش آنے والا ہے۔ قرآن کا سلسلہ شمس و قمر کی طرح چلتا رہے گا اور جب کوئی واقعہ پیش آجائے گا قرآن منطبق ہوجائے گا۔ پروردگار نے فرمایا ہے: ''اس کی تاویل کا علم صرف خدا اور راسخون فی العلم کو ہے'' اور راسخون سے مراد ہم لوگ ہیں۔[1]

[18] اَبُو الصَّبَاحِ: وَاللهِ! لَقَدْ قَالَ لِيْ جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ: اِنَّ اللهَ عَلَّمَ نَبِيَّهُ التَّنْزِيْلَ وَالتَّاْوِيْلَ. فَعَلَّمَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ عَلِيًّا عَلَيْهِ السَّلَامُ. قَالَ: وَعَلَّمَنَا وَاللهِ۔

ابوالصباح روایت کرتے ہیں: خدا کی قسم مجھ سے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے: اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنزیل و تاویل دونوں کا علم دیا ہے اور آپؐ نے سب علی بن ابی طالب علیہ السلام کے حوالے کردیا ہے اور پھر یہ علم ہمیں دیا گیا ہے۔[2]

[19] اَلْاِمَامُ الْهَادِيْ عَلَيْهِ السَّلَامُ - فِيْ زِيَارَةِ صَاحِبِ الْاَمْرِ: اَللّٰهُمَّ وَصَلِّ عَلَى الْاَئِمَّةِ الرَّاشِدِيْنَ، وَالْقَادَةِ الْهَادِيْنَ، وَالسَّادَةِ الْمَعْصُوْمِيْنَ، وَالْاَتْقِيَآءِ الْاَبْرَارِ، مَاْوَى السَّكِيْنَةِ وَالْوَقَارِ، وَخُزَّانِ الْعِلْمِ، وَمُنْتَهَى الْحِلْمِ وَالْفَخَارِ، سَاسَةِ الْعِبَادِ، وَاَرْكَانِ الْبِلَادِ، وَاَدِلَّةِ الرَّشَادِ، اَلْاَلِبَّآءِ الْاَمْجَادِ، اَلْعُلَمَآءِ بِشَرْعِكَ الزُّهَّادِ، وَمَصَابِيْحِ الظُّلَمِ، وَيَنَابِيْعِ الْحِكَمِ، وَاَوْلِيَآءِ النِّعَمِ، وَعِصَمِ الْاُمَمِ، قُرَنَآءِ التَّنْزِيْلِ وَاٰيَاتِهٖ، وَاُمَنَآءِ التَّاْوِيْلِ وَوُلَاتِهٖ، وَتَرَاجِمَةِ الْوَحْيِ وَدَلَالَاتِهٖ۔

حضرت امام علی نقی علیہ السلام نے حضرت صاحب الامر علیہ السلام کے سلسلے میں فرمایا: خدایا! درود و سلام بھیج آئمہ راشدین پر، حق کے پیشواؤں پر، معصوم سرداروں پر، نیکوکار متقین پر، سکون و وقار کی منازل پر، علم کے خزانہ داروں پر، حلم کی انتہاؤں پر، بندوں پر حکومت کرنے والوں پر، شہروں کے ارکان پر، نیکی کے راہنماؤں پر، صاحبان عقل و بزرگی پر، شریعت کے عالم وزہد کے پیکروں پر، تاریکیوں کے چراغوں پر، حکمت کے چشموں پر، نعمتوں کے مالکوں پر، امتوں کے محافظوں پر، تنزیل کے ساتھیوں پر، تاویل

[1] تفسیر عیاشی، ج ۱، ص ۱۱، حدیث ۵۔ بصائر الدرجات، ص ۲۰۳، حدیث ۲۔

[2] الکافی، ج ۷، ص ۴۴۲، حدیث ۱۵۔ تہذیب الاحکام، ج ۸، ص ۲۸۶، حدیث ۱۰۵۲۔ تفسیر عیاشی، ج ۱، ص ۱۷، حدیث ۱۳۔

کے امینوں اور والیوں پر، وحی کے ترجمانوں اور دلائل پر۔[1]

۳۔اسم اعظم کا علم:

[20] اَلْاِمَامُ الْبَاقِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اِنَّ اسْمَ اللهِ الْاَعْظَمَ عَلٰى ثَلَاثَةٍ وَّسَبْعِيْنَ حَرْفًا. وَكَانَ عِنْدَ اٰصَفَ مِنْهَا حَرْفٌ وَّاحِدٌ فَتَكَلَّمَ بِهٖ فَخَسَفَ بِالْاَرْضِ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ سَرِيْرِ بِلْقِيْسَ، حَتّٰى تَنَاوَلَ السَّرِيْرَ بِيَدِهٖ. ثُمَّ عَادَتِ الْاَرْضُ كَمَا كَانَتْ اَسْرَعَ مِنْ طَرْفَةِ عَيْنٍ. وَنَحْنُ عِنْدَنَا مِنَ الْاِسْمِ الْاَعْظَمِ اثْنَانِ وَسَبْعُوْنَ حَرْفًا. وَحَرْفٌ وَّاحِدٌ عِنْدَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ اسْتَاْثَرَ بِهٖ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَهٗ. وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: الٰہی اسم اعظم تہتر (۷۳) حروف پر مشتمل ہے۔ جناب آصف برخیا کے پاس اس کا ایک حرف تھا جس کو زبان پر جاری کر کے انہوں نے اپنے مقام اور جناب بلقیس کے درمیانی فاصلے کو پلک جھپکنے سے بھی کم مدت میں لپیٹ دیا اور تخت کو اٹھا لیا جس کے بعد زمین اپنی اصلی حالت کو پلٹ گئی۔ اور ہمارے پاس اللہ کے اسم اعظم کے بہتر (۷۲) حروف ہیں اور ایک حرف اللہ کے پاس ہے جسے اس نے علم غیب کی صورت میں اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ اور کوئی قوت وطاقت نہیں ہے سوائے اللہ بزرگ وباعظمت کی قوت وطاقت کے۔[2]

[21] اَلْاِمَامُ الصَّادِقُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اِنَّ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اُعْطِيَ حَرْفَيْنِ كَانَ يَعْمَلُ بِهِمَا. وَاُعْطِيَ مُوْسٰى اَرْبَعَةَ اَحْرُفٍ. وَاُعْطِيَ اِبْرَاهِيْمُ ثَمَانِيَةَ اَحْرُفٍ. وَاُعْطِيَ نُوْحٌ خَمْسَةَ عَشَرَ حَرْفًا. وَاُعْطِيَ اٰدَمُ خَمْسَةً وَّعِشْرِيْنَ حَرْفًا. وَاِنَّ اللهَ تَعَالٰى جَمَعَ ذٰلِكَ كُلَّهٗ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ. وَاِنَّ اسْمَ اللهِ الْاَعْظَمَ ثَلَاثَةٌ وَّسَبْعُوْنَ حَرْفًا. اُعْطِيَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ اثْنَيْنِ وَسَبْعِيْنَ حَرْفًا وَّحُجِبَ عَنْهُ حَرْفٌ وَّاحِدٌ۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جناب عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو (اسم اعظم کے) دو (۲) حرف عطا ہوئے تھے جن سے سارا کام کر رہے تھے اور جناب موسیٰ علیہ السلام کو چار (۴) حرف عطا ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آٹھ (۸) حرف ملے تھے اور حضرت نوح علیہ السلام کو پندرہ (۱۵) حرف اور حضرت آدم علیہ السلام کو پچیس (۲۵) حرف اور اللہ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے سب جمع کر دیئے۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۰۲، ص ۱۸۰۔

[2] الکافی، ج ۱، ص ۲۳۰، حدیث ۱۔

بیشک اللہ کے اسم اعظم کے تہتر (۷۳) حروف ہیں جن میں سے بہتر (۷۲)، اپنے پیغمبر کو عنایت فرمائے ہیں اور ایک اپنی ذات کیلئے مخصوص کرلیا ہے۔[1]

[22] اَلْاِمَامُ الْهَادِیْ عَلَیْهِ السَّلَامُ: اِسْمُ اللهِ الْاَعْظَمُ ثَلَاثَةٌ وَسَبْعُوْنَ حَرْفًا. كَانَ عِنْدَ اٰصَفَ حَرْفٌ فَتَكَلَّمَ بِهٖ فَانْخَرَقَتْ لَهُ الْاَرْضُ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ سَبَإٍ. فَتَنَاوَلَ عَرْشَ بِلْقِيْسَ حَتّٰى صَيَّرَهٗ اِلٰى سُلَيْمَانَ. ثُمَّ انْبَسَطَتِ الْاَرْضُ فِيْ اَقَلَّ مِنْ طَرْفَةِ عَيْنٍ. وَعِنْدَنَا مِنْهُ اثْنَانِ وَسَبْعُوْنَ حَرْفًا. وَحَرْفٌ عِنْدَ اللهِ مُسْتَاْثَرٌ بِهٖ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ۔

حضرت امام علی نقی علیہ السلام کا ارشاد ہے: اللہ کے اسم اعظم کے تہتر (۷۳) حرف ہیں۔ آصف بن برخیا کے پاس ایک حرف تھا جس کو زبان پر لانے سے چشم زدن سے بھی کم مدت میں ملک سبا تک کی زمینیں سمٹ گئیں اور انہوں نے تخت بلقیس کو اٹھا کر جناب سلیمانؑ کے سامنے پیش کر دیا اور ہمارے پاس اسم اعظم کے بہتر (۷۲) حرف ہیں۔ صرف ایک نام خدا نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔[2]

۴۔ تمام زبانوں کا علم:

[23] اِبْنُ شَهْرْ اٰشُوْبَ فِي الْمَنَاقِبِ۔ فِيْ اَحْوَالِ الْاِمَامِ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔: رُوِيَ اَنَّهٗ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِاِبْنَةِ يَزْدَجِرْدَ: مَا اسْمُكِ؟ قَالَتْ: جَهَانْ بَانُوَيْهِ فَقَالَ: بَلْ شَهْرَ بَانُوَيْهِ. وَاَجَابَهَا بِالْعَجَمِيَّةِ۔

کتاب مناقب ابن شہر آشوب میں حضرت علیؑ کے حالات میں نقل ہوا ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے یزدجرد کی بیٹی سے اس کا نام دریافت کرتے ہوئے پوچھا: تمہارا کیا نام ہے؟ اس نے کہا: جہان بانو۔ آپؑ نے فرمایا: نہیں، تمہارا نام شہر بانو ہے۔ آپؑ نے اس کے ساتھ یہ گفتگو فارسی زبان میں فرمائی۔[3]

[24] سَمَاعَةُ بْنُ مِهْرَانَ عَنْ شَيْخٍ مِّنْ اَصْحَابِنَا عَنْ اَبِيْ جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ: جِئْنَا نُرِيْدُ الدُّخُوْلَ عَلَيْهِ. فَلَمَّا صِرْنَا فِي الدِّهْلِيْزِ سَمِعْنَا قِرَآءَةً سُرْيَانِيَّةً بِصَوْتٍ حَزِيْنٍ يَقْرَاُ وَيَبْكِيْ حَتّٰى اَبْكٰى بَعْضَنَا۔

سماعہ بن مہران نے بعض شیوخ کے حوالے سے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے اس واقعہ کو نقل کیا ہے کہ میں حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جب دہلیز پر پہنچا تو سنا کہ آپؑ درد بھری آواز میں سریانی

---

[1] الکافی، ج ۱، ص ۲۳۰، حدیث ۲۔ بصائر الدرجات، ص ۲۰۸، حدیث ۲۔ تاویل الآیات الظاہرۃ، ص ۴۷۹۔

[2] الکافی، ج ۱، ص ۲۳۰، حدیث ۳۔ مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۴۰۶۔ اثبات الوصیۃ، ص ۲۵۴۔

[3] مناقب ابن شہر آشوب، ج ۲، ص ۶۵۔

زبان میں کچھ پڑھ رہے ہیں اور گریہ فرما رہے ہیں یہاں تک کہ ہم لوگوں پر بھی گریہ طاری ہوگیا۔[1]

[25] مُوْسَى بْنُ اُكَيْلٍ النُّمَيْرِيُّ: جِئْنَا اِلٰى بَابِ دَارِ اَبِيْ جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ نَسْتَاْذِنُ عَلَيْهِ. فَسَمِعْنَا صَوْتًا حَزِيْنًا يَقْرَاُ بِالْعِبْرَانِيَّةِ. فَدَخَلْنَا عَلَيْهِ وَسَئَلْنَا عَنْ قَارِئِهٖ فَقَالَ: ذَكَرْتُ مُنَاجَاةَ اِيْلِيَا فَبَكَيْتُ مِنْ ذٰلِكَ۔

موسیٰ بن اکیل نمیری کا بیان ہے کہ ہم حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے دروازہ پر اذن باریابی کیلئے حاضر ہوئے تو عبرانی زبان میں ایک دردناک آواز سنائی دی اور حاضری کے بعد ہم نے دریافت کیا کہ اس کا قاری کون تھا؟ تو آپؑ نے فرمایا: مجھے ایلیا کی مناجات یاد آگئی تو مجھ پر گریہ طاری ہوگیا۔[2]

[26] اَحْمَدُ بْنُ قَابُوْسَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ اَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: دَخَلَ عَلَيْهِ قَوْمٌ مِّنْ اَهْلِ خُرَاسَانَ. فَقَالَ۔ ابْتِدَآءً قَبْلَ اَنْ يُّسْئَلَ۔: مَنْ جَمَعَ مَالًا يَحْرُسُهٗ عَذَّبَهُ اللّٰهُ عَلٰى مِقْدَارِهٖ. فَقَالُوْا لَهٗ۔ بِالْفَارِسِيَّةِ۔: لَا نَفْهَمُ بِالْعَرَبِيَّةِ. فَقَالَ لَهُمْ: هر كه درم اندوزد جزايش دوزخ باشد۔

احمد بن قابوس نے اپنے والد کے حوالہ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں نقل کیا ہے کہ آپؑ کے پاس اہل خراسان کی ایک جماعت حاضر ہوئی تو آپؑ نے ان کی جانب سے کوئی سوال پوچھے جانے سے قبل فرمایا: جو شخص بھی مال جمع کر کے اس کی حفاظت پر بیٹھ جائے، اللہ اس پر اسی کے مقدار کے برابر عذاب کرے گا۔ یہ سن کر ان لوگوں نے عرض کی: (مولا!) ہم عربی زبان نہیں جانتے ہیں، تو آپؑ نے فارسی میں فرمایا: ''هر كه درم اندوزد جزايش دوزخ باشد''۔[3]

[27] اَبُوْ بَصِيْرٍ: قُلْتُ لِاَبِي الْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ: جُعِلْتُ فِدَاكَ! بِمَ يُعْرَفُ الْاِمَامُ؟ فَقَالَ: بِخِصَالٍ: اَمَّا اَوَّلُهَا فَاِنَّهٗ بِشَيْءٍ قَدْ تَقَدَّمَ مِنْ اَبِيْهِ فِيْهِ بِاِشَارَةٍ اِلَيْهِ لِتَكُوْنَ عَلَيْهِمْ حُجَّةً. وَ يُسْئَلُ فَيُجِيْبُ. وَاِنْ سُكِتَ عَنْهُ ابْتَدَاَ. وَيُخْبِرُ بِمَا فِيْ غَدٍ. وَيُكَلِّمُ النَّاسَ بِكُلِّ لِسَانٍ. ثُمَّ قَالَ لِيْ: يَآ اَبَا مُحَمَّدٍ! اُعْطِيْكَ عَلَامَةً قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ. فَلَمْ اَلْبَثْ اَنْ دَخَلَ عَلَيْنَا رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ خُرَاسَانَ. فَكَلَّمَهُ الْخُرَاسَانِيُّ بِالْعَرَبِيَّةِ فَاَجَابَهٗ اَبُو الْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالْفَارِسِيَّةِ. فَقَالَ لَهُ الْخُرَاسَانِيُّ: وَاللّٰهِ! جُعِلْتُ فِدَاكَ! مَا مَنَعَنِيْ اَنْ اُكَلِّمَكَ بِالْخُرَاسَانِيَّةِ غَيْرُ اَنِّيْ ظَنَنْتُ

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۱۹۵۔

[2] مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۱۹۵۔

[3] الخرائج والجرائح، ج ۲، ص ۷۵۳، حدیث ۷۰۔

اَنَّكَ لَاتُحْسِنُهَا. فَقَالَ: سُبْحَانَ اللهِ! اِذَا كُنْتُ لَآ اُحْسِنُ اُجِيْبُكَ فَمَا فَضْلِيْ عَلَيْكَ؟ ثُمَّ قَالَ لِيْ: يَآ اَبَا مُحَمَّدٍ! اِنَّ الْاِمَامَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ كَلَامُ اَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ وَلَا طَيْرٍ وَّلَا بَهِيْمَةٍ وَّلَا شَيْءٍ فِيْهِ الرُّوْحُ. فَمَنْ لَّمْ يَكُنْ هٰذِهِ الْخِصَالُ فِيْهِ فَلَيْسَ هُوَ بِاِمَامٍ۔

ابوبصیر کہتے ہیں: میں نے حضرت ابوالحسن امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی: میں آپؑ پر قربان! (مولا!) امام کی معرفت کا ذریعہ کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا: امام کی پہچان کچھ اوصاف سے ہوتی ہے جن میں پہلا وصف یہ ہے کہ اس کے پدر بزرگوار کی طرف سے اس کے بارے میں اشارہ ہوتا ہے تا کہ لوگوں پر حجت تمام ہوجائے اور اس سے سوال کیا جائے اور وہ جواب دے اور اگر دریافت نہ کیا جائے تو خود ابتدا کرے اور مستقبل کے حالات سے بھی آگاہ کرے اور ہر زبان میں کلام کر سکے! اے ابومحمد! میں تمہارے اٹھنے سے پہلے تم کو اس کی نشانی دکھاؤں گا۔ ابوبصیر کہتے ہیں: ابھی میں اٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک مرد خراسانی وارد ہوا اور اس نے عربی میں آپؑ سے کچھ سوالات کئے جن کے جوابات آپ نے فارسی میں دیئے تو مرد خراسانی نے کہا: (مولا!) میں نے فارسی میں اس لئے کلام نہیں کیا کہ شاید آپؑ اسے نہ جانتے ہوں تو آپؑ نے فرمایا: سبحان اللہ! اگر میں تمہاری زبان میں جواب نہ دے سکوں تو میری فضیلت ہی کیا ہے۔ دیکھو! ابومحمد! امام پر کسی انسان، پرندے، جانور اور ذی روح کا کلام مخفی نہیں ہوتا ہے اور اگر کسی میں یہ کمالات نہ ہوں تو وہ امام نہیں ہے۔[1]

[28] اَبُو الصَّلْتِ الْهَرَوِيُّ: كَانَ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ يُكَلِّمُ النَّاسَ بِلُغَاتِهِمْ. وَكَانَ وَاللهِ اَفْصَحَ النَّاسِ وَاَعْلَمَهُمْ بِكُلِّ لِسَانٍ وَّلُغَةٍ. فَقُلْتُ لَهٗ يَوْمًا: يَابْنَ رَسُوْلِ اللهِ! اِنِّيْ لَاَعْجَبُ مِنْ مَّعْرِفَتِكَ بِهٰذِهِ اللُّغَاتِ عَلَى اخْتِلَافِهَا! فَقَالَ: يَآ اَبَا الصَّلْتِ! اَنَا حُجَّةُ اللهِ عَلٰى خَلْقِهٖ. وَمَا كَانَ اللهُ لِيَتَّخِذَ حُجَّةً عَلٰى قَوْمٍ وَّ هُوَ لَا يَعْرِفُ لُغَاتِهِمْ. اَوَمَا بَلَغَكَ قَوْلُ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اُوْتِيْنَا فَصْلَ الْخِطَابِ؟! فَهَلْ فَصْلُ الْخِطَابِ اِلَّا مَعْرِفَةُ اللُّغَاتِ؟۔

ابوالصلت ہروی کی روایت ہے: حضرت امام علی رضا علیہ السلام تمام لوگوں سے ان کی زبان میں کلام فرماتے تھے اور ہر زبان ولغت والوں سے زیادہ فصیح زبان بولتے تھے۔ ایک دن میں نے عرض کی: یابن رسول اللہؑ! مجھے آپؑ کے اس قدر زبانیں جاننے پر تعجب ہوتا ہے تو آپؑ نے فرمایا: ابوالصلت! میں مخلوقات پر خدا کی حجت ہوں اور خدا کسی ایسے شخص کو حجت نہیں بنا سکتا ہے جو قوم کی زبان سے باخبر نہ ہو۔

---

[1] الکافی، ج۱، ص ۲۸۵، حدیث ۷۔ دلائل الامامۃ، ص ۳۳۷، حدیث ۲۹۴۔ قرب الاسناد، ص ۳۳۹، حدیث ۱۲۲۴۔

کیا تم نے جناب امیر المومنین علی علیہ السلام کا یہ کلام نہیں سنا ہے کہ: ''ہمیں فصل الخطاب کا علم دیا گیا ہے'' اور قول فیصل معرفت لغات کے علاوہ اور کیا ہے۔[1]

[29] اَبُوْ هَاشِمٍ الْجَعْفَرِیُّ: كُنْتُ بِالْمَدِیْنَةِ حِیْنَ مَرَّ بِهَا بُغَآءٌ اَیَّامَ الْوَاثِقِ فِیْ طَلَبِ الْاَعْرَابِ. فَقَالَ اَبُو الْحَسَنِ عَلَیْهِ السَّلَامُ: اُخْرِجُوْا بِنَا حَتّٰی نَنْظُرَ اِلٰی تَعْبِیَةِ هٰذَا التُّرْكِیِّ. فَخَرَجْنَا فَوَقَفْنَا. فَمَرَّتْ بِنَا تَعْبِیَتُهٗ. فَمَرَّ بِنَا تُرْكِیٌّ فَكَلَّمَهٗ اَبُو الْحَسَنِ عَلَیْهِ السَّلَامُ بِالتُّرْكِیَّةِ. فَنَزَلَ عَنْ فَرَسِهٖ فَقَبَّلَ حَافِرَ دَابَّتِهٖ. قَالَ: فَحَلَّفْتُ التُّرْكِیَّ وَقُلْتُ لَهٗ: مَا قَالَ لَكَ الرَّجُلُ؟ قَالَ: هٰذَا نَبِیٌّ؟ قُلْتُ: لَیْسَ هٰذَا بِنَبِیٍّ. قَالَ: دَعَانِیْ بِاسْمٍ سُمِّیْتُ بِهٖ فِیْ صِغَرِیْ فِیْ بِلَادِ التُّرْكِ مَا عَلِمَهٗ اَحَدٌ اِلَی السَّاعَةِ۔

ابو ہاشم جعفری کا بیان ہیں کہ میں مدینہ میں تھا جب واثق باللہ کے زمانہ میں ترک سپہ سالار بغاء کا گزر ہوا تو حضرت امام علی نقی علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے ساتھ چلو تا کہ میں دیکھوں کہ ان ترکوں نے کیا انتظام کر رکھا ہے۔ ہم لوگ حضرتؑ کے ساتھ باہر نکلے تو اس کی فوجیں گزر رہی تھیں۔ ایک ترکی شخص سامنے سے گزرا تو آپؑ نے اس سے ترکی زبان میں کچھ کہا جسے سن کر وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور آپؑ کی سواری کے سموں کو چومنے لگا۔ ہم لوگوں نے اسے قسم دے کر پوچھا کہ انہوں نے تم سے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا: کیا یہ نبی ہیں؟ ہم نے کہا: نہیں! اس نے کہا: انہوں نے مجھے اس نام سے پکارا ہے جو میرے بچپنے میں میرے شہر میں رکھا گیا تھا اور اسے آج تک کوئی نہیں جانتا ہے۔[2]

[30] عَلِیُّ بْنُ مَهْزِیَارَ ۔ فِیْ صِفَةِ الْهَادِیْ عَلَیْهِ السَّلَامُ ۔: دَخَلْتُ عَلَیْهِ فَابْتَدَاَنِیْ وَكَلَّمَنِیْ بِالْفَارِسِیَّةِ۔

علی بن مہزیار نے حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے حالات میں نقل کیا ہے کہ میں آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؑ نے مجھ سے فارسی میں بولنا شروع کر دیا۔[3]

[31] عَلِیُّ بْنُ مَهْزِیَارَ: اَرْسَلْتُ اِلٰی اَبِی الْحَسَنِ الثَّالِثِ عَلَیْهِ السَّلَامُ غُلَامِیْ ۔ وَكَانَ صِقْلَابِیًّا۔ فَرَجَعَ الْغُلَامُ اِلَیَّ مُتَعَجِّبًا. فَقُلْتُ لَهٗ: مَا لَكَ یَا بُنَیَّ؟ قَالَ: وَكَیْفَ لَا اَتَعَجَّبُ؟! مَا زَالَ یُكَلِّمُنِیْ بِالصِّقْلَابِیَّةِ كَاَنَّهٗ وَاحِدٌ مِّنَّا. فَظَنَنْتُ اَنَّهٗ اِنَّمَا اَرَادَ بِهٰذَا اللِّسَانِ كَیْ لَا یَسْمَعَ بَعْضُ الْغِلْمَانِ

[1] عیون اخبار الرضا، ج ۲، ص ۲۲۸، حدیث ۳۔

[2] اعلام الوریٰ، ص ۳۴۳۔ الثاقب فی المناقب، ص ۵۳۸، حدیث ۴۷۸۔ مناقب ابن شہر آشوب، ج ۴، ص ۴۰۸۔

[3] بصائر الدرجات، ص ۳۳۳، حدیث ۱۔

مَا دَارَ بَيْنَهُمْ۔

علی بن مہزیار کا بیان ہے: میں نے حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں اپنے غلام کو بھیجا جو صقلابی (بلغاری) تھا۔ وہ آپؑ کے ہاں سے انتہائی حیرت زدہ واپس آیا۔ میں نے پوچھا: خیر تو ہے؟ اس نے کہا: یہ تو مجھ سے صقلابی زبان میں اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے وہ ہمارے ہی ایک فرد ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ مجھ سے اس زبان میں اس لئے باتیں کر رہے تھے کہ دوسرے غلام نہ سمجھنے پائیں۔ [1]

[32] اَبُو حَمْزَةَ نَصِيرٌ الْخَادِمُ: سَمِعْتُ اَبَا مُحَمَّدٍ [الْعَسْكَرِيَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ] غَيْرَ مَرَّةٍ يُكَلِّمُ غِلْمَانَهُ بِلُغَاتِهِمْ: تُرْكٍ وَرُومٍ وَصَقَالِبَةٍ. فَتَعَجَّبْتُ مِنْ ذٰلِكَ وَقُلْتُ: هٰذَا وُلِدَ بِالْمَدِينَةِ وَلَمْ يَظْهَرْ لِاَحَدٍ حَتّٰى مَضٰى اَبُو الْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَلَا رَاٰهُ اَحَدٌ. فَكَيْفَ هٰذَا؟ اُحَدِّثُ نَفْسِيْ بِذٰلِكَ. فَاَقْبَلَ عَلَيَّ فَقَالَ: اِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى بَيَّنَ حُجَّتَهُ مِنْ سَائِرِ خَلْقِهِ بِكُلِّ شَيْءٍ. وَيُعْطِيْهِ اللُّغَاتِ وَمَعْرِفَةَ الْاَنْسَابِ وَالْاٰجَالِ وَالْحَوَادِثِ. وَلَوْلَا ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ بَيْنَ الْحُجَّةِ وَالْمَحْجُوْجِ فَرْقٌ۔

ابوحمزہ نصیر الخادم کا بیان ہے: میں نے حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کو بارہا اپنے غلاموں سے ان کی زبان میں بات کرتے سنا، کبھی ترکی، کبھی رومی اور کبھی صقلابی میں۔ ایک دفعہ میں نے حیرت زدہ ہوکر دل ہی دل میں کہا آخر ان کی ولادت مدینہ میں ہوئی ہے اور یہ اپنے والد امام علی نقیؑ کی شہادت تک باہر بھی نہیں نکلے ہیں تو اس قدر زبانیں کس طرح جانتے ہیں؟ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ حضرتؑ نے میری طرف رخ کر کے فرمایا: پروردگار نے اپنی حجت کو ہر لحاظ سے واضح فرمایا ہے اور وہ اسے تمام لغات، انساب، موت اور حوادث سب کا علم عطا کرتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اس میں اور قوم میں کیا فرق رہ جاتا۔ [2]

(جاری ہے)

☼☼☼☼☼

---

[1] الاختصاص، ص ۲۸۹۔ مناقب ابن شہرآشوب، ج ۴، ص ۴۰۸۔ کشف الغمۃ، ج ۳، ص ۱۷۹۔

[2] الکافی، ج ۱، ص ۵۰۹، حدیث ۱۱۔ روضۃ الواعظین، ص ۲۷۳۔ مناقب ابن شہرآشوب، ج ۴، ص ۴۲۸۔ الخرائج والجرائح، ج ۱، ص ۴۳۶، حدیث ۱۴۔ کشف الغمۃ، ج ۳، ص ۲۰۲۔ اعلام الوریٰ، ص ۲۵۶۔ بصائر الدرجات، ص ۳۳۳۔

قسط:19

شرحِ چہل حدیث

آیت اللہ العظمیٰ امام خمینیؒ

تیسری فصل: احوال نفس میں تفکر

تفکر کا ایک درجہ احوال نفس میں غور وفکر کرنا ہے جس سے بے شمار نتیجے اور بہت سے معارف حاصل ہوتے ہیں۔ اس وقت ہماری نظر دو نتیجوں کی طرف ہے:

پہلا: یوم معاد (قیامت) کا علم۔

دوسرا: بعثت رسل وانزال کتب، یعنی نبوت عامہ اور شرائع حقہ۔

نفس کی ایک حالت ''تجرد'' ہے۔ بڑے بڑے حکماء نے جتنی توجہ نفس کے مجرد ہونے پر کی ہے، بہت کم کسی حکمت کے مسئلے پر اتنی اہمیت دی ہے اور نہ اس طرح کسی مسئلے کو براہین سے واضح کیا ہے۔ میں اس وقت اس کو تفصیلی طور پر ثابت کرنے کے درپے نہیں ہوں۔ (صرف) بعض ان دلیلوں پر اکتفا کروں گا جن کے مبادی بہت زیادہ مشکل نہ ہوں اور اس کے بعد اپنے مقصد کا ذکر کروں گا۔

تو آیئے عرض کروں: اطباء اور علم اعضاء کی معرفت رکھنے والے دانشوروں کا اتفاق ہے اور تجربہ (بھی گواہ) ہے کہ تمام اعضائے بدن، مغز سے لیکر جو ادراک کا مرکز اور نفس کی قوتوں کے ظہور کی جگہ ہے جسم کے آخری گندے اعضاء (اور صلب کی ہڈی تک) تیس یا پینتیس سال کے بعد کمزور ہونے لگتے ہیں اور زوال وضعف کے افق سے نزدیک ہونے لگتے ہیں۔ خود ہمارا تجربہ ہے کہ پورے بدن میں ضعف وسستی کا غلبہ ہو جاتا ہے، لیکن اسی وقت سے یعنی ۳۰، ۴۰ سال کے بعد سے روحانی قوتیں اور عقلی ادراک کامل ہونے کے ساتھ رشد اور پختگی حاصل کرنے لگتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ عقل کے قوائے ادراکیہ جسمانی نہیں ہیں (بلکہ مجرد ہیں)۔ اس لئے کہ اگر یہ قویٰ جسمانی ہوتیں تو دیگر جسمانی اعضاء کی طرح یہ بھی کمزور ہونے لگتیں۔ واضح رہے کہ فکری قوتوں کو کثرت سے استعمال کرنے اور عقلی قوتوں کے تجربات کی وجہ سے عقلی قوتیں قوی تر ہوجاتی ہیں، کیونکہ تمام جسمانی قوتیں کثرت استعمال اور زیادہ سرگرم ہونے کی وجہ سے کمزور وضعیف ہوجاتی ہیں، مگر عقلی قوتیں قوی وطاقتور رہوتی ہیں۔ یہ خود دلیل ہے کہ عقلی قوتیں نہ جسم ہیں اور نہ جسمانی ہیں۔

اور یہ اعتراض کرنا کہ بڑھاپے میں فکری قوتیں بھی ناقص ہوجاتی ہیں غلط ہے۔ اس لئے کہ پہلی بات تو یہی ہے کہ کوئی بھی جسمانی قوت بڑھاپے تک رشد ونمو حاصل نہیں کرتی کہ ہم یہ کہہ سکیں جسم کا فلاں حصہ ادراکات عقلیہ کا محل ہے اور بڑھاپے تک ترقی حاصل کررہا ہے، لیکن اب چونکہ وہ حصہ کمزور ہوگیا اس لئے قوت فکر بھی کمزور ہوگئی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بڑھاپے میں فکر بھی کمزور ہوجائے گی جو جسم میں حلول کرنے والی قوتوں میں سے ہے یا وہ جسمانی قوتوں کی محتاج ہے، لیکن خالص ادراکات اور ملکات فاضلہ یا خبیثہ بھی اس وقت پہلے سے قوی ہوجاتے ہیں، اگرچہ ان کا اظہار یا ظہور کم ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے دعویٰ کو ثابت کرنے کیلئے ۴۰، ۵۰ سال کی عمر والی قوت ادراک ہی کافی ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نفس جب ملک بدن سے اپنا بوریا بستر باندھنے لگتا ہے اور اس کی قوتیں اس کے باطن ذات کی طرف رجوع کرتی ہیں تو تمام وہ قوتیں جو عالم جسم وجسمانی سے نزدیک ہیں وہ تھکن اور سستی کی طرف مائل ہوجاتی ہیں اور جو دور ہیں وہ دیر میں کمزور ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف عالم ملکوت وتجرد کی قوتیں قوی تر اور مضبوط تر ہوجاتی ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نفس نہ جسم ہے اور نہ جسمانی۔

نیز، نفس کے افعال، آثار اور خواص مطلق اجسام کے افعال وآثار وخواص کے برخلاف ہوتے ہیں اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ نفس جسم نہیں ہے۔ مثلاً ہم کو معلوم ہے کہ ایک جسم ایک صورت سے زیادہ قبول نہیں کرتا۔ اگر دوسری صورت قبول کرنا چاہے تو پہلی صورت کے ختم ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ مثلاً اگر

ایک کاغذ کے اوپر ایک تصویر بنی ہے تو جس جگہ تصویر بنی ہے بالکل اسی جگہ دوسری تصویر نہیں بن سکتی جب تک پہلی تصویر مٹا نہ دی جائے اور یہ حکم تمام اجسام میں عقلی طور سے جاری ہے۔لیکن نفس کے اندر ایک وقت میں متعدد متضاد صورتیں منقش ہوسکتی ہیں بغیر پہلی صورت کے زائل ہوئے۔

نیز، ہر جسم میں متناہی و محدود صورتوں کو نقش کیا جاسکتا ہے، لیکن نفس کے اندر غیر متناہی وغیر محدود صورتیں نقش ہوسکتی ہیں۔اس اعتبار سے نفس غیر متناہی امور پر حکم کرسکتا ہے۔

نیز جسم کی صورت زائل ہونے کے بعد جب تک اس صورت کیلئے از سر نو سبب پیدا نہ ہو دوبارہ وہ صورت پیدا نہیں ہوگی، لیکن نفس سے جو صورتیں غائب ہو جاتی ہیں وہ کسی بیرونی سبب کے بغیر پلٹ آتی ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ نفس اپنے خواص و آثار و افعال میں تمام اجسام کے برخلاف ہے۔بنابریں نفس مجرد ہے اور جسم و جسمانیات کے قسم سے نہیں ہے اور مجردات فاسد نہیں ہوتے جیسا کہ اپنی جگہ پر براہین سے ثابت ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ جب تک مادۂ قابلہ نہ ہو اس میں فساد نہیں ہوتا اور مجرد میں مادۂ قابلہ ہوتا ہی نہیں، کیونکہ مادۂ قابلہ جسم کے لوازم سے ہے پس مجرد و فاسد نہیں ہوسکتا۔

پس اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بدن کے خراب ہوجانے اور نفس کے بدن سے جدا ہوجانے کے بعد بھی نفس خراب نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے عالم میں باقی رہتا ہے۔اس کیلئے فنا نہیں ہے۔نفس و ارواح کیلئے قیامت سے پہلے یہ معاد روحانی ہے جو ان کیلئے اس وقت حاصل رہتا ہے جب تک ارادۂ الٰہی ایک بار پھر ان کے جسموں سے تعلق پیدا نہ کرلے۔ہم اس وقت ان لوگوں کی رد کر رہے ہیں جو مطلق معاد کے منکر ہیں۔اسی لئے ہم نے مطلق معاد کو ثابت کیا ہے اور سابقہ بیانات سے یہ بات واضح ہوگئی۔

یہ جان لینا چاہیے کہ نفوس کیلئے بھی صحت و بیماری، اصلاح و فساد اور سعادت و شقاوت ہے، لیکن ان کے راستوں کا جان لینا اور ان کے مفاسد و مصالح کی باریکیوں کو سمجھ لینا خدا کے علاوہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ضروری طور پر ایسے نظام میں جو سب سے مکمل اور مستحسن نظام ہے، نیز اس سے پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اس کا منتظم حکیم علی الاطلاق اور تمام باتوں سے واقف ہے، سعادت و شقاوت، ہدایت (و

ضلالت) راہ صلاح وفساد، نفوس کے علاج کے طریقوں کا تعلیم نہ دینا یا مہمل چھوڑ دینا محال ہے، کیونکہ مہمل چھوڑ دینے کی صورت میں یا تو علم میں یا پھر قدرت میں نقص لازم آئے گا اور یا بلاوجہ کے بخل وظلم لازم آئیں گے اور یہ معلوم ہے کہ خدا ان تمام باتوں سے مبرا ہے اور وہ کامل علی الاطلاق اور مطلقاً فیض پہنچانے والا ہے۔ سعادت وشقاوت کے راستوں کو بتانے میں سستی سے تو حکمت میں خلل عظیم اور نظام و مملکت میں خرابی اور بہت بڑی رکاوٹ پیش آئے گی۔ اس لئے کامل نظام کے اندر ضروری ہے کہ سعادت وشقاوت اور ہدایت کے راستوں کو بتایا جائے۔

اس بیان سے دو واضح نتیجے نکلتے ہیں:

پہلا نتیجہ شریعت ہے جو نفسانی امراض کے علاج کا نسخہ ہے اور یہ خدا کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ خداوند عالم اس کے اعلان کا پابند ہے اور معلوم ہے کہ اتنے بڑے مقصد اور باریکیوں پر مشتمل علم کامل کی تعلیم یقیناً وحی والہام کے ذریعے ہونی چاہیے، جس کے ادراک سے عقلاء کے عقول عاجز ہیں اور ملک وملکوت کا رابطہ اور باطن نفس کے اندر صور ملکیہ کی تاثیر کو کوئی نہیں جانتا، یعنی اس کی تعلیم خدا کی طرف سے ہونی چاہیے اور یہ (بھی) واضح ہے کہ تمام افراد بشر اس خلعت کے قابل نہیں ہیں اور نہ اس مقام کی استعداد رکھتے ہیں اور نہ اس فریضے کو انجام دے سکتے ہیں۔ کئی صدیوں میں کہیں ایک ایسا شخص پیدا ہوتا ہے جو اتنی بھاری ذمہ داری نبھانے کا لائق وسزاوار ہوتا ہے اور ایسے عظیم مقصد کو پورا کرسکتا ہے۔ (ایسے شخص کو) خدا بشر کی سعادت وشقاوت کے راستے سمجھانے کیلئے بھیجتا ہے (تاکہ) لوگوں کو ان کے مفادات سے آگاہ کرے۔ اسی کو ''نبوت عامہ'' کہا جاتا ہے۔

جب گفتگو یہاں تک پہنچی ہے تو ضمناً میں ایک ایسا مطلب بیان کرنا چاہتا ہوں جو میری نظر میں بدیہیات میں شمار کئے جانے کے لائق ہے اور وہ یہ کہ ہم کو بدیہی طور سے معلوم ہے کہ انسانوں کے درمیان خدا کی طرف سے ایک شریعت ہونی چاہیے اور جب ہم ان شریعتوں کی طرف نظر ڈالتے ہیں جو نوع بشر کے درمیان رائج ہیں تو ان میں تین شریعتیں، دیگر شریعتوں سے عمدہ اور اہم نظر آتی ہیں:

۱۔ شریعت یہود ۲۔ شریعت نصاریٰ ۳۔ شریعت اسلام

''مگر تین مقامات پر شریعت اسلام بدیہی طور پر دوسری شریعتوں سے کامل تر ہے اور انہی مقامات پر شریعتوں کی بنیاد اور تشریع کا دارومدار ہے''۔

(اور وہ تینوں چیزیں یہ ہیں:)

پہلی بات: عقائد حقہ ومعارف الٰہیہ، توصیف وتنزیہ خدا، معاد واس کی کیفیت، ملائکہ کا علم، توصیف و تنزیہ انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہے اور یہ بات شرائع میں بنیادی اور اہم حیثیت کی حامل ہے۔

دوسری بات: خصال حمیدہ واصلاح نفس واخلاق فاضلہ ہے۔

اور تیسری بات کا تعلق انفرادی اور اجتماعی اعمال کے ڈھانچے سے ہے جس میں سیاسی اور معاشرتی امور شامل ہیں، بلکہ انصاف پسند اگر بے غرض ہو کر دیکھے تو پتہ چلے گا کہ یہود ونصاریٰ کی شریعتوں کی اسلام سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ انسان کی پوری زندگی میں اتنا مضبوط قانون اور (اتنی جامع) شریعت کا وجود نہیں تھا اور یہ خود ہی اسلام کی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ''نبوت عامہ'' اور یہ کہ خدا نے انسان کیلئے ایک شریعت معین فرمائی اور لوگوں کو ہدایت کے راستے سمجھائے اور ان سب کو ایک منظم نظام کے تحت قرار دیا۔ ان تمام باتوں کو ثابت کرنے کے بعد دین اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کیلئے کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔ سوائے خود اسلام پر نظر ڈالنے اور ان تمام مراحل میں اسلام اور دوسرے ادیان وشرائع کے درمیان موازنہ کرنے کے جو انسانی ضروریات پورا کرنے کیلئے مقصود ہوتے ہیں۔ ان میں (دین) حق کی تعلیمات اور نفسانی اقدار کے علاوہ معاشرتی اور ایک مفہوم ہے جس میں فرمایا گیا ہے: اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْ وَ لَا یُعْلٰی عَلَیْہِ[1]۔ اس لئے کہ انسانی عقل چاہے جتنی ترقی کرے اور عقلوں کے ادراکات چاہے جتنے زیادہ ہو جائیں جب وہ اسلام کے دلائل وبراہین پر نظر کریں گے تو وہ (اسلام کے) نور ہدایت کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے اور دنیا کی کوئی دلیل اسلام پر غالب نہیں آسکے گی۔

خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے اثبات کیلئے ہمارے دلائل کا نچوڑ یہ ہے کہ جس طرح تخلیق

---

[1] یعنی اسلام سب سے برتر ہے اور اس سے کوئی چیز برتر نہیں ہے۔

کائنات کی مضبوطی اور اس کی حسن ترتیب و بہترین نظم ہم کو یہ بتاتا ہے کہ ایک ایسا موجود ہے جو اس کی تنظیم کرتا ہے، جس کا علم تمام باریکیوں، خوبیوں اور کمالات پر محیط ہے، اسی طرح ایک شریعت کے احکام کا اتقان، حسن نظام، ترتیب کامل، تمام مادی و معنوی، دنیوی و اخروی، اجتماعی و فردی ضروریات کا مکمل طور سے متکفل ہونا بھی ہم کو یہ بتاتا ہے کہ اس کے منتظم اور چلانے والے کا علم بھی لامحدود ہوگا اور وہ افراد بشر کی ضرورتوں سے واقف ہوگا اور چونکہ یہ بات بدیہی ہے کہ یہ سارا کام ایک ایسے انسان کی عقلی قوتوں کے ہرگز مرہون منت نہیں ہوسکتا، جس نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہ کیا ہو، جس کی تاریخ حیات ہر قوم وملت کے مؤرخین نے لکھی ہو، جس نے ایک ایسے ماحول میں تربیت پائی ہو جو کمالات و معارف سے عاری ہو۔ ایسا شخص اتنا کامل نظام نہیں بنا سکتا۔ اس لئے یقیناً غیب اور ماوراء الطبیعیہ سے اس شریعت کی تشریح ہوئی ہے اور وحی والہام کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچائی گئی ہے: وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى وُضُوْحِ الْحُجَّةِ: (تمام تعریف اللہ کیلئے ہے اس واضح دلیل پر)۔

میرا ارادہ تھا کہ تفکر کے دوسرے مقام کا ذکر کروں، یعنی عالم ملک کی فکر کے بارے میں بحث کروں جس کا نتیجہ ''زہد'' ہے، لیکن چونکہ سابق مقامات میں عنان قلم کو چھوٹ دے دی تھی اور مطلب طولانی (بلکہ) موضوع سے خارج ہوگیا تھا، لہٰذا اس سے صرف نظر کرتا ہوں۔

چوتھی فصل: شب بیداری کی فضیلت

اب حدیث شریف کے دو فقروں کا بیان ہمارے ذمہ رہ گیا جس میں فرمایا گیا ہے:

جَافِ عَنِ اللَّيْلِ جَنْبَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ رَبَّكَ۔

''اپنے پہلو کو رات (بستر) سے دور کرو اور اپنے خدا سے ڈرو!''۔

مولا میر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اس حدیث شریف میں قلبی اعمال اور تنبیہ کرنے والے تفکرات اور تقوائے الٰہی کے پہلو بہ پہلو شب بیداری اور بستر سے دوری کو بھی عبادت کیلئے (ضروری) قرار دیا ہے اور یہ (نماز شب) کی فضیلت و اہمیت پر دلیل ہے۔ چنانچہ احادیث میں اس عمل کی بہت اہمیت بیان کی گئی ہے اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام و مشائخ عظام و علمائے کرام کی یہ سیرت رہی ہے کہ ہمیشہ اس (نماز شب)

کے پابند رہے ہیں، بلکہ رات کے آخری حصے میں بیداری کو عبادت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی بہت اہمیت دیتے تھے۔ کتاب وسائل الشیعہ جو مذہب امامیہ کی ایک عظیم ترین کتاب ہے اور جس پر مذہب کا دارومدار ہے اور جو فقہاء وعلماء کی مرجع ہے، اس میں نماز شب کی فضیلت میں اکتالیس (۴۱) حدیثیں اور اس کے ترک کے مکروہ ہونے پر چند حدیثوں کو ذکر کیا گیا ہے اور پھر سابق ولاحق (مستحب ومکروہ) کیلئے حوالے بھی نقل کئے گئے ہیں[1]۔ اس کے علاوہ دُعاؤں وغیرہ کی کتابوں میں اس بارے میں بے حد و حساب حدیثیں ذکر کی گئی ہیں، لیکن ہم حصول برکت کیلئے چند حدیثوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں:

عَنِ الكَافِيْ بِاسْنَادِهٖ عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ عَمَّارٍ قَالَ: سَمِعْتُ اَبَا عَبْدِاللهِ عَلَيْهِ السَّلامُ يَقُوْلُ: كَانَ فِيْ وَصِيَّةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ لِعَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلامُ اَنْ قَالَ: يَا عَلِيُّ! اُوْصِيْكَ فِيْ نَفْسِكَ بِخِصَالٍ فَاحْفَظْهَا. ثُمَّ قَالَ: اَللّٰهُمَّ اَعِنْهُ. اِلَى اَنْ قَالَ: وَعَلَيْكَ بِصَلٰوةِ اللَّيْلِ وَعَلَيْكَ بِصَلٰوةِ اللَّيْلِ وَعَلَيْكَ بِصَلٰوةِ اللَّيْلِ۔

کافی میں معاویہ بن عمار سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امام علی علیہ السلام کو جو وصیت فرمائی تھی اس میں فرمایا تھا: ''یا علیؑ! میں تمہیں تمہاری ذات کے بارے میں چند باتوں کی وصیت کرتا ہوں ان کو محفوظ کرلو۔ (اس کے بعد فرمایا:) پروردگار! علیؑ کی مدد کر۔۔۔ (یہاں تک کہ فرمایا:) نماز شب کی پابندی کرو، نماز شب کی پابندی کرو، نماز شب کی پابندی کرو''۔[2]

حدیث کی ابتدا وانتہا سے (نماز شب کی) حد سے زیادہ اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۵، ص ۲۶۸۔۲۸۱، کتاب الصلوٰۃ، ابواب بقیۃ الصلوات المندوبۃ، باب ۳۰ و ۴۰۔

[2] روضۂ کافی، ج ۸، ص ۷۹، حدیث ۳۳۔

وَعَنِ الخِصَالِ بِاِسْنَادِهٖ عَنْ اَبِیْ عَبْدِاللّٰهِ عَلَیْهِ السَّلَامُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ لِجِبْرَئِیْلَ: عِظْنِیْ. فَقَالَ: یَا مُحَمَّدُ! عِشْ مَا شِئْتَ فَاِنَّكَ مَیِّتٌ. وَاَحْبِبْ مَا شِئْتَ فَاِنَّكَ مُفَارِقُهٗ. وَاعْمَلْ مَا شِئْتَ فَاِنَّكَ مُلَاقِیْهِ. شَرَفُ الْمُؤْمِنِ صَلٰوتُهٗ بِاللَّیْلِ. وَعِزُّهٗ كَفُّهٗ عَنْ اَعْرَاضِ النَّاسِ۔

کتاب خصال میں حضرت امام جعفر صادق سے (مروی) ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

''رسول خدا نے جبرئیل سے فرمایا: مجھے وعظ ونصیحت کرو! حضرت جبرئیلؑ نے کہا: اے محمدؐ! جتنا جی چاہے زندہ رہو مگر مرنا ہے، جس سے جی چاہے محبت کرو مگر اس سے جدا ہونا ہے، جو عمل چاہے کرو اسی سے پالا پڑنا ہے۔ یہ جان لیجئے کہ مؤمن کا شرف شب بیداری (نماز شب) میں ہے اور اس کی عزت لوگوں کی عزت و ناموس پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہنے میں ہے''۔[1]

وَفِی الْمَجَالِسِ بِاِسْنَادِهٖ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ. قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ فِیْ حَدِیْثٍ: فَمَنْ رُزِقَ صَلٰوةَ اللَّیْلِ مِنْ عَبْدٍ اَوْ اَمَةٍ قَامَ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مُخْلِصًا. فَتَوَضَّاَ وُضُوْءًا سَابِغًا وَصَلّٰی لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ بِنِیَّةٍ صَادِقَةٍ وَّ قَلْبٍ سَلِیْمٍ وَبَدَنٍ خَاشِعٍ وَّعَیْنٍ دَامِعَةٍ. جَعَلَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی خَلْفَهٗ تِسْعَةَ صُفُوْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ. فِیْ كُلِّ صَفٍّ مَّا لَا یُحْصِیْ عَدَدَهُمْ اِلَّا اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی. اَحَدُ طَرَفَیْ كُلِّ صَفٍّ بِالْمَشْرِقِ وَالْاٰخَرُ بِالْمَغْرِبِ. فَاِذَا فَرَغَ كَتَبَ لَهٗ بِعَدَدِهِمْ دَرَجَاتٍ۔

امالی شیخ صدوقؒ میں ابن عباسؓ سے روایت کی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا: ''جس بندے یا کنیز کو نماز شب کی توفیق ہو اور وہ خلوص کے ساتھ (بستر سے) اٹھے، کامل وضو کرے اور قلب سلیم و سچی نیت اور خاشع بدن اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے خدا کیلئے نماز (شب) پڑھے تو خدا اس کے پیچھے ملائکہ کی نو (۹) صفوں کو قرار دیتا

[1] خصال، باب ۱، حدیث ۱۹۔ وسائل الشیعہ، ج ۵، ص ۲۶۹، کتاب الصلوٰۃ، باب ۳۹، حدیث ۲۹۔

ہے اور ہر صف میں اتنے فرشتے ہوتے ہیں جن کی تعداد خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، ہر صف کا ایک سرا مشرق اور دوسرا مغرب میں ہوتا ہے اور جب وہ نماز سے فارغ ہوتا ہے تو خدا ان ملائکہ کی تعداد کے مطابق اس شخص کیلئے درجات لکھ دیتا ہے''۔[1]

وَعَنِ العِلَلِ (عِلَلِ الشَّرَائِعِ)، بِاِسْنَادِهٖ عَنْ اَنَسٍ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ يَقُوْلُ: الرَّكْعَتَانِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔

علل الشرائع میں جناب انسؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''آدھی رات کو دو رکعت نماز مجھے دنیا و مافیہا سے محبوب ہے''۔[2]

اور بہت سی احادیث میں ہے کہ ''نماز شب مومن کا شرف ہے اور جس طرح مال و اولاد دنیا کی زینت ہیں اسی طرح نماز شب آخرت کی زینت ہے''۔[3]

وَعَنِ العِلَلِ (عِلَلِ الشَّرَائِعِ)، بِاِسْنَادِهٖ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ يَقُوْلُ: مَا اتَّخَذَ اللهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا اِلَّا لِاِطْعَامِهِ الطَّعَامَ وَصَلٰوتِهٖ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ۔

علل الشرائع میں جناب جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت کی ہے: میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''خدا تعالیٰ نے جناب ابراہیمؑ کو اس لئے خلیل بنایا کیونکہ وہ لوگوں کو کھانا کھلاتے تھے اور جب رات کو لوگ سو رہے ہوتے تھے تو آپ نماز شب پڑھ رہے ہوتے تھے''۔[4]

---

[1] امالی شیخ صدوقؒ، ص ۶۸۔

[2]

[3] وسائل الشیعہ، ج ۵، ص ۲۸۰، کتاب الصلوٰۃ، باب ۴۰، حدیث ۱۳۔

[4] علل الشرائع، باب ۳۲، حدیث ۴۔ وسائل الشیعہ، ج ۵، ص ۲۷۵، کتاب الصلوٰۃ، باب ۳۹، حدیث ۳۰۔

اگر نماز شب کیلئے صرف یہی ایک حدیث ہوتی تب بھی اس کی اہمیت کیلئے کافی تھی۔ البتہ اس کی اہلیت رکھنے والوں کیلئے، مجھ جیسے نااہلوں کیلئے نہیں۔ ہم لوگوں کو نہیں معلوم کہ ''خلّت'' کونسی خلعت ہے، اور خدا کسی بندے کو دوست بنائے تو اس کا کیا مرتبہ ہے؟ عقل انسانی اس کے تصور سے عاجز ہے۔ اگر خلیل خدا کو تمام بہشت دے دیئے جائیں تو وہ ان کی طرف نظر بھی نہ کریں گے۔ تم اگر کوئی محبوب عزیز یا محبوب دوست رکھتے ہو اور وہ تمہارے پاس آجائے تو تم بھی ہر قسم کی ناز و نعمت کو ٹھکرا کر جمال محبوب اور لقائے دوست کی وجہ سے تمام چیزوں سے بے پروا ہو جاؤ گے، حالانکہ یہ مثال نامناسب ہے اور دونوں میں بعد المشرقین کا فرق ہے۔

وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ بِاِسْنَادِهٖ، عَنْ اَبِيْ عَبْدِاللهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: مَا مِنْ عَمَلٍ حَسَنٍ يَعْمَلُهُ الْعَبْدُ اِلَّا وَلَهٗ ثَوَابٌ فِي الْقُرْاٰنِ اِلَّا صَلٰوةَ اللَّيْلِ. فَاِنَّ اللهَ لَمْ يُبَيِّنْ ثَوَابَهَا لِعِظِيْمِ خَطَرِهَا عِنْدَهٗ. فَقَالَ: ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۫ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾[1]۔

علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا: ''بندہ جو کچھ بھی نیک عمل کرتا ہے قرآن میں اس کا ثواب ہے، سوائے نماز شب کے! اس کی عظمت کی بنا پر حدا نے اس کا ثواب نہیں بیان کیا: چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ''رات کے وقت ان کے پہلو بستروں سے آشنا نہیں ہوتے اور (عذاب کے) خوف اور (رحمت کی) امید پر اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ عطا کیا ان میں سے وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی کارگزاریوں کے بدلے میں کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کیلئے ڈھکی چھپی رکھی ہے، اس کو تو کوئی جانتا ہی نہیں ہے''۔

اب خداوند عالم نے جو قرۃ العین (آنکھوں کی ٹھنڈک) ذخیرہ فرمائی ہے اور چھپا رکھی ہے، جس پر

---

[1] سورۂ سجدہ، آیت ۱۶۔۱۷۔

کوئی شخص مطلع نہیں ہے آخر وہ کیا ہے اور کیا ہوسکتی ہے؟ اگر وہ بہتی نہروں، اونچے محلات اور دیگر بہشتی نعمتوں جیسی کوئی نعمت ہوتی تو دیگر اعمال کی طرح اس کو بھی بیان کر دیتا اور ملائکہ اس پر مطلع ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ اور ہے اس کی عظمت اس سے زیادہ ہے کہ کسی سے بیان کی جائے، خصوصاً اس دنیا کے رہنے والوں کیلئے۔ اس عالم (آخرت) کی نعمتوں کا قیاس اس دنیا کی نعمتوں پر نہ کرو۔ یہ سوچو بھی نہیں کہ وہاں بہشت و باغات یہاں کی طرح ہیں یا ذرا وہ زیادہ وسیع و عریض ہیں۔ وہاں دار کرامت حق اور الٰہی مہمان خانہ ہے۔ یہاں کی پوری دنیا وہاں کی بہشتی حورالعین کے ایک بال کے بھی برابر نہیں ہے، بلکہ اہل جنت کیلئے بنائے گئے بہشتی زیوروں کے کسی ایک تار سے بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود خداوند عالم نے نماز شب پڑھنے والے کی جزا میں ان چیزوں کو قرار نہیں دیا ہے! مقام تعظیم میں ان کا ذکر کیا ہے۔ مگر افسوس ہمارا ایمان کمزور ہے اور ہم اہل یقین نہیں ہیں ورنہ ناممکن تھا کہ ہم اس طرح غافل رہتے اور صبح تک خواب خرگوش میں پڑے رہتے اور اگر شب بیداری انسان کو حقیقت اور سر نماز سے آگاہ کر دے اور انسان حق کے ذکر و فکر سے مانوس ہو جائے اور راتوں کو نماز اس کی عادت بن جائے، یعنی راتیں اس کے معراج کی سواری بن کر قرب خدا کا ذریعہ بن جائیں[1] تو خدا کے جمال جمیل کے علاوہ اس کی کوئی دوسری جزا ممکن نہیں ہوسکتی۔

ہم اہل غفلت کی حالت پر افسوس کہ آخر عمر تک خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتے اور طبیعت کی مستی پر باقی رہتے ہیں، بلکہ ہر (آنے والا) دن ہماری مستی و غفلت کو بڑھاتا ہی رہتا ہے۔ ہم حیوانی چیزوں، کھانے پینے اور جنسی عمل کے علاوہ کچھ سمجھتے ہی نہیں اور جو بھی کرتے ہیں، چاہے عبادت ہی ہو، وہ پیٹ بھرنے اور جنسی خواہشات کی تکمیل کیلئے کرتے ہیں۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ خلیل الرحمٰنؑ کی نماز

---

[1] خداوند عالم نماز شب اور شب بیداری کے سلسلے میں فرماتا ہے: ﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝﴾: ''یقیناً راتوں کو اٹھنا (نفس کو) شدید روندتا ہے اور ذکر کیلئے مناسب ہے۔ یقیناً آپؐ کیلئے دن میں بڑی تلاش و کوشش ہے''۔ (سورۂ مزمل، آیت ۶۔۷)

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں: إِنَّ الْوُصُولَ إِلَى اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ سَفَرٌ لَا يُدْرَكُ إِلَّا بِامْتِطَاءِ اللَّيْلِ: ''خدا تک رسائی ایک سفر ہے جو مرکب شب پر سوار ہوئے بغیر طے نہیں ہوسکتا''۔ (بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۳۸۰)

ہماری نماز کی طرح تھی؟ خلیلؑ نے اپنی حاجت جبرئیلؑ سے طلب نہیں کی[1] اور ہم اپنی حاجتوں کو اگر گمان کرلیں کہ حاجت روا ہے، شیطان سے بھی طلب کرتے ہیں!

(ان سب باتوں کے باوجود) مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے ایک مدت تک شب بیداری کرنے، اس سے مانوس ہونے اور اس کے عادی ہونے کے بعد رفتہ رفتہ خدا تمہاری دستگیری کرے اور ایک لطف خفی کے ساتھ خلعت رحمت سے نواز دے، لیکن اجمالاً سرّ عبادت سے عافل نہ رہو اور صرف تجوید وقرائت اور ظاہری تصحیح سے پڑھنے کی طرف متوجہ نہ رہو اور اگر مخلص نہیں بن سکتے تو تو کم از کم اس قرۃ العین کی تلاش کرو جس کو خدا نے چھپا رکھا ہے اور فقیر عاصی، حیوان سیرت جو تمام درجات کو چھوڑ کر حیوانیت پر قناعت کر بیٹھا ہے اگر ممکن ہو تو اس کیلئے دُعا کرو اور پوری توجہ وخلوصِ نیت سے کہو:

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی التَّجَافِیْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَ الْاِنَابَةَ اِلٰی دَارِ الْخُلُوْدِ

وَالْاِسْتِعْدَادِ لِلْمَوْتِ قَبْلَ حُلُوْلِ الْفَوْتِ۔

پالنے والے ہم کو دار غرور سے دور رکھ اور دار خلد (زندہ وجاوید دنیا) کیلئے توبہ کی

توفیق عطا کر اور فوت سے پہلے کی استعداد عطا کر۔[2]

پانچویں فصل: تقویٰ کے بارے میں

''تقویٰ وقایہ سے (مشتق) ہے جس کے معنی حفاظت ونگہداری کے ہیں اور عرف اور روایات کی زبان میں ''خدا کے اوامر ونواہی کی مخالفت سے اپنے نفس کو بچانے اور رضائے الٰہی کی پیروی کرنے'' کے ہیں۔ ویسے زیادہ تر اس لفظ کا استعمال محرمات میں پڑ جانے کے ڈر سے مشتبہ چیزوں سے بھی نفس کو مکمل طریقہ سے محفوظ رکھنے کے معنی میں ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

وَ مَنْ اَخَذَ بِالشُّبُھَاتِ ارْتَکَبَ الْمُحَرَّمَاتِ وَ ھَلَکَ مِنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُ۔

---

[1] طبرسی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے: ''جب جناب ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق میں رکھ کر آگ میں پھینکا جانے لگا تو جناب جبرئیلؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور بولے: کیا کوئی حاجت ہے؟ ابراہیمؑ نے کہا: ہے، مگر تم سے نہیں''۔
(احتجاج طبرسی، ج ۱، ص ۲۵)

[2] اقبال الاعمال، ج ۱، ص ۲۲۸۔

اور جو شخص مشتبہ چیزوں (جن کا حلال وحرام ہونا واضح نہ ہو) میں پڑ جاتا ہے وہ
محرمات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور نا معلوم جگہ سے ہلاک ہوتا ہے۔[1]

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تقویٰ اگرچہ مدارج کمال اور اعلیٰ مقامات میں سے نہیں ہیں، لیکن تقویٰ کے بغیر کسی منزل تک پہنچنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب تک نفس محرمات کی گندگی سے آلودہ رہتا ہے نہ باب انسانیت میں داخل ہوتا ہے اور نہ اس راہ کا سالک ہوسکتا ہے اور جب تک لذتوں کا عادی اور نفسانی خواہشات اور لذتوں کی مٹھاس اس کے کام (ودہن) میں ہے، وہ انسانی کمالات کا پہلا مقام حاصل نہیں کرسکتا اور جب تک دنیا سے محبت اور لگاؤ اس کے دل میں باقی ہیں وہ متوسطین وزاہدین کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا اور جب تک حُب نفس اس کی ذات میں پوشیدہ ہے مخلصین ومحبین کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا اور جب تک ملک وملکوت کی کثرت اس کے قلب میں ظاہر ہے، مجذوبین کے درجات تک نہیں پہنچ سکتا اور جب تک کثرات اسماء اس کے باطنِ ذات میں متجلی ہے فنائے کلی نہیں پاسکتا اور جب تک قلب مقامات کی طرف التفات رکھتا ہے مقام فنا تک نہیں پہنچ سکتا اور جب تک تلوین موجود ہے مقام تمکین تک نہیں رسائی نہیں ہوسکتی اور اس میں اسم ذاتی کی ابدی اور ازلی تجلی نہیں ہوسکتی۔

پسعام لوگوں کا تقویٰ محرمات سے بچنا، خواص کا تقویٰ مشتبہ اور مشکوک چیزوں سے پرہیز، زاہدوں کا تقویٰ دنیا سے کٹ جانا، مخلصوں کا تقویٰ حب نفس سے عاری ہونا، مجذوبوں کا تقویٰ کثرات افعالی کے ظہور سے اجتناب، فنافی اللہ والوں کا تقویٰ کثرات اسماء سے قطع تعلقی، مقام وصل والوں کا تقویٰ فنا سے توجہ ہٹالینا اور مقام تمکین والوں کا تقویٰ تلوین سے دوری میں ہے۔ ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾[2]۔

ان میں سے ہر مرتبے کیلئے ایک شرح ہے اور ان سب کا ذکر اصلاحات کی دنیا میں حیران ہونے اور مفاہیم کے حجاب میں پوشیدہ ہو جانے کے علاوہ ہم جیسے لوگوں کیلئے اور کسی نتیجے کا حامل نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر میدان کیلئے کچھ اہل ہوتے ہیں۔ اب ہم آپ کی توجہ تقویٰ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو عام لوگوں کیلئے اہم ہے۔

---

[1] اصول کافی، ج ۱، ص ۱۲۲، کتاب فضل العلم، باب اختلاف الحدیث، باب ۱۲، حدیث ۱۰۔

[2] سورۂ ہود، آیت ۱۱۲۔ ترجمہ: ''(اے رسولؐ! آپ کو جیسا حکم دیا گیا ہے ثابت قدم رہیے)''۔

چھٹی فصل: تقوائے عامہ کا بیان

اے عزیز! جان لو کہ جس طرح اس بدن کی صحت و مرض ہوتی ہے اور ان کے علاج کیلئے طبیب (ضروری) ہے، اسی طرح نفس انسانی اور روح آدمی کیلئے بھی صحت و مرض، علاج و معالجہ اور معالج ضروری ہے۔ صحت نفس کا مطلب یہ ہے کہ طریق انسانیت میں اعتدال اور مرض و سقم کا مطلب ہے راستے سے بھٹکنا اور راہِ انسانیت سے انحراف۔ نفسانی امراض کی اہمیت جسمانی امراض کے مقابلے میں ہزاروں درجہ زیادہ ہے۔ اس لئے کہ جسمانی امراض کا نتیجہ موت ہوا کرتا ہے۔ موت کے آتے ہی نفس کی توجہ جسم سے ختم ہو جاتی ہے، تمام جسمانی امراض اور مادی خرابیاں اس سے دور ہو جاتی ہیں اور کوئی جسمانی مرض اور نفسانی بیماری باقی نہیں رہتی، لیکن اگر خدانخواستہ روحانی امراض اور نفسانی بیماری ہو تو نفس کی توجہ پہلے بدن سے ہٹ کر اپنے ملکوت کی طرف ہوگی اور یہی امراض و اسقام کی پیدائش کی پہلی منزل ہے۔ دنیا کی طرف توجہ اور اس سے تعلق کی مثال ان نشہ آور چیزوں کی طرح ہے جو انسان کو بے خود بنا دیتی ہیں اور تعلق روح کا دنیائے بدن سے سلب ہونا اس کے ہوش میں آنے کا باعث ہوتا ہے اور ہوش میں آتے ہی باطن ذات میں موجود تمام امراض اور آلام و اسقام (دفعتاً) اس پر حملہ کر دیتے ہیں اور تمام وہ امراض جو اب تک چھپے ہوئے تھے خاکستر میں چھپی ہوئی آگ کی طرح ظاہر ہو جاتے ہیں اور وہ امراض و آلام یا تو زائل ہی نہیں ہوتے اور اس کے ساتھ رہتے ہیں اور اگر زائل بھی ہوتے ہیں تو ہزاروں سال کے فشار و زحمت، آگ اور حرارتوں کے بعد زائل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: "اٰخِرُ الدَّوَآءِ الْکَیُّ: ''آخری علاج داغنا اور جلانا ہے''[1]۔ نیز ارشاد خداوندی ہے:

﴿یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ﴾

جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور ان کے پشت داغے جائیں گے۔[2]

---

[1] یہ مشہور مثل ہے جو نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶۸ میں آئی ہے۔ ''کَیّ'' کا معنی گرم لوہے سے داغنا ہے جو بعض زخموں کیلئے آخری علاج ہے۔

[2] سورۂ توبہ، آیت ۳۵۔

انبیائے کرام علیہم السلام شفیق طبیب کی طرح ہیں جو مریضوں کے حالات کے مطابق بڑی شفقت و مہربانی اور ہمدردی سے ان کی صحت کیلئے مختلف قسم کے نسخے لاتے ہیں اور ہدایت کے راستوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ (ہم لوگ طبیب ہیں اور حق کے شاگرد)[1] روحی قلبی اور بدنی وظاہری اعمال کی حیثیت امراض کے دواؤں کی سی ہے۔ چنانچہ تقویٰ کی حیثیت اپنے تمام مراتب کے ساتھ ایسی ہی ہے جیسے بیماری میں ضرر رساں چیزوں سے پرہیز کی حیثیت ہوتی ہے۔ جب تک مریض پرہیز نہیں کرے گا، نہ اچھا ہوگا اور نہ حکیم کے نسخے کا کوئی اثر ہوگا۔ جسمانی امراض میں تو کبھی یہ (بھی) ممکن ہوجاتا ہے کہ معمولی سی بد پرہیزی کے ساتھ اگر دوا کھاتے رہیں تو طبیعت اور دوا کا غلبہ ہونے کی وجہ سے صحت حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ طبیعت خود بھی تو صحت کی حافظ ہے اور دوا اس کی مددگار ہے۔

مگر روحانی امراض کا مسئلہ بہت مشکل ہے۔ وہاں تو طبیعت شروع ہی سے نفس پر غالب ہوتی ہے اور نفس الٹا اثر کرتا ہے اور خرابی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾[2] اس لئے تھوڑی سے بد پرہیزی سے نفس پر مرض غالب آجاتا ہے اور چاروں طرف سے خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں یہاں تک کہ اس کی صحت بالکل ہی ختم ہوجاتی ہے۔

پس جو شخص صحت نفس کی طرف مائل ہو اور اپنے حال پر مہربان ہو اور اپنی صحت سے دلچسپی رکھتا ہو، اس کو یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ عذاب الیم سے چھٹکارے کا انحصار انبیاء علیہم السلام کے حکم پر عمل کرنے پر ہے اور انبیاء علیہم السلام کے تمام فرامین واحکام کا انحصار دو چیزوں یعنی نفس کی اصلاح اور اس کو سلامت رکھنے والی چیزوں کا استعمال اور اس کو نقصان پہنچانے والی چیزوں سے پرہیز پر ہے، یہ تو معلوم ہی ہے کہ نفسانی برائیوں میں حرام چیزوں کا ضرر سب سے زیادہ ہے۔ اسی لئے ان کو حرام کیا گیا ہے اور اصلاح کرنے والی چیزوں میں واجبات کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اسی لئے انہیں واجب کیا گیا ہے اور یہی دونوں مرحلے ہر چیز سے افضل اور ہر مقصد سے مقدم، ترقی وپیشرفت کی تمہید اور مدارج ومقامات انسانی کی ترقی

---

[1] یہ مثنوی (دفتر ۳، بیت ۲۷۴۲) کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے:

ما طبیبانیم شاگردان حق بحر قلزم دیدمار افانفلق

[2] سورۂ یوسف، آیت ۵۳۔ ترجمہ: ''یقیناً نفس برائی پر اُکساتا ہے''۔

کے منحصر راستے ہیں۔ پس اگر کسی نے ان چیزوں کی پابندی کی تو اہل سعادت ونجات ہے اور ان دونوں میں بھی اہم حرام چیزوں سے اجتناب وتقویٰ ہے۔ اہل سلوک بھی اسی مقام کو مقام اوّل پر مقدم شمار کرتے ہیں۔ روایات واخبار اور نہج البلاغہ کے خطبوں کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ حضرات معصومین علیہم السلام بھی اسی مرحلہ کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

لہٰذا میرے عزیز! اس پہلے مرحلے کو بہت اہم سمجھو اور اس کی زیادہ پابندی اور رعایت کرو، کیونکہ اگر پہلا قدم تم نے صحیح اٹھایا اور اس بنیاد کو مضبوط کر لیا تو دیگر مقامات تک پہنچنے کی امید ہے، ورنہ دوسرے مقامات تک پہنچنا ممکن ہے اور نجات بہت ہی مشکل ودشوار ہے۔

جناب عارف بزرگوار اور ہمارے عالی مرتبہ شیخ قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے:

''سورۂ حشر کی آخری آیتوں [1] کو نمازوں کے بعد تعقیبات میں، ان کے معنی میں غور وفکر کرتے ہوئے پڑھنا، خصوصاً رات کے آخری حصہ میں جب دل فارغ ہوتا ہے، اصلاح

---

[1] یعنی سورۂ حشر کی آیت ۱۸ تا ۲۴ جن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿١٩﴾ لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۚ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٢٠﴾ لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۚ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١﴾ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۖ هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ﴿٢٢﴾ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٢٣﴾ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۚ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٢٤﴾ ترجمہ: ''اے ایمان والو! خدا سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل (یعنی فردائے قیامت) کیلئے کیا (سامان) بھیجا ہے اور (ہم پھر کہتے ہیں کہ) خدا سے ڈرتے رہو بے شک خدا تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے۔ اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے، یہ بدکردار لوگ ہیں۔ اہل دوزخ اور اہل بہشت برابر نہیں۔ اہل بہشت تو کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے۔ اور یہ باتیں ہم لوگوں کیلئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور وفکر کریں۔ وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، بادشاہ (حقیقی) پاک ذات (ہر عیب سے) سلامتی امن دینے والا نگہبان غالب زبردست بڑائی والا، خدا ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔ وہی خدا (تمام مخلوقات کا) خالق، ایجاد واختراع کرنے والا صورتیں بنانے والا اس کے سب اچھے سے اچھے نام ہیں، جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اس کی تسبیح کرتی ہیں اور وہ غالب، حکمت والا ہے''۔

نفس کیلئے بہت ہی مؤثر ہے۔ نیز شیطان اور نفس کے شر سے بچنے کیلئے''۔

موصوف ہمیشہ باوضو رہنے کا حکم دیتے اور فرماتے تھے:

''وضو، بمنزلہ فوجی وردی ہے۔ ہر حال میں خدائے ذوالجلال سے تضرع وزاری کے ساتھ دُعا کرو کہ تمہیں اس مرحلے میں توفیق عطا کرے اور صفت تقویٰ کرے حصول میں تمہاری مدد کرے''۔

اور جان لو کہ شروع میں یہ بات ذرا سخت اور مشکل معلوم ہوگی، لیکن کچھ دنوں کی پابندی کے بعد زحمت، راحت میں بدل جائے گی اور مشقت، آسانی سے، بلکہ ایک خالص روحانی لذت میں بدل جائے گی کہ اس کے اہل تمام لذتوں کے مقابلے میں اس کو ترجیح دیں گے اور (پھر یہ بھی) ممکن ہے کہ تم ان شاء اللہ سخت پابندی اور مکمل تقویٰ کے بعد اس مقام سے ترقی کر کے تقوائے خاص تک پہنچ جاؤ اور یہ تقویٰ نفسانی لذات میں سے ہوگا۔ اس لئے کہ جب روحانی لذت کا مزہ چکھ لو گے تو رفتہ رفتہ جسمانی لذتوں سے دور ہو جاؤ گے اور ان سے پرہیز کرنے لگو گے اور اس وقت راہ سہل و آسان ہو جائے گی اور پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ فانی اور نفسانی لذتوں کو ہیچ سمجھنے لگو گے، بلکہ ان سے متنفر ہو جاؤ گے اور دنیا کی زیب وزینت تمہاری نظروں میں بری اور بے ہودہ نظر آنے لگے گی اور تم محسوس کرنے لگو گے کہ اس دنیا کی ہر لذت نفس پر اثر انداز ہوتی ہے اور دل پر ایک سیاہ دھبہ ڈال دیتی ہے جو اس دنیا سے شدید انس ومحبت کا سبب بن جاتا ہے اور یہ خود زمین میں ہمیشہ رہنے (کی امید) کا سبب بنتا ہے اور موت کے وقت ذلّت وسختی و زحمت فشار میں بدل جاتا ہے، کیونکہ سکرات موت اور نزع روح کی سختی انہی دنیاوی لذتوں اور حبّ دنیا کی بنا پر ہوتی ہے۔ جیسا اس سے پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اور جب انسان اس مطلب کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس دنیا کی لذتیں اس کی نظروں میں بالکل بے معنی ہو جاتی ہیں اور وہ دنیا و زیبائش دنیا سے بیزار ہو جاتا ہے اور اس سے بھاگنے لگتا ہے اور یہ خود تقویٰ کے مقام دوم سے اس کے تیسرے مقام کی طرف ترقی کے مترادف ہے۔ اس کے بعد سلوک الی اللہ کا راستہ سہل وہموار ہو جاتا ہے اور انسانیت کا راستہ اس کیلئے وسیع وروشن ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس

کا ہر قدم حق کا قدم اور اس کی ریاضت، ریاضت حق ہو جاتی ہے اور وہ نفس اور اس کے اطوار و آثار سے بھاگنے لگتا ہے اور اپنے اندر حق سے محبت کا مشاہدہ کرتا ہے اور بہشت و حور و قصور کے وعدوں پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ اس کا منظور نظر اور مقصد کوئی دوسرا ہوتا ہے۔ خود بینی و خود غرضی سے نفرت کرتا ہے، محبت نفس سے بچتا ہے، اپنی طرف توجہ کرنے سے پرہیز کرتا ہے اور خود غرضی کے قریب نہیں پھٹکتا۔ یہ بہت اعلیٰ و بلند مرتبہ اور خوشبوئے ولایت کے حصول کا پہلا درجہ ہے۔ خداوند عالم اپنے پہلوئے لطف میں اس کو جگہ دیتا ہے اور اس کی دستگیری کرتا ہے اور پر خصوصی لطف و کرم نازل کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد سالک کیلئے جو چیزیں پیش آتی ہیں، ان کا بیان طاقت قلم سے بھی باہر ہیں۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّ اٰخِرًا وَّ ظَاھِرًا وَّ بَاطِنًا وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ

(اختتام حدیث دوازدہم)

(جاری ہے)

*****

غدیر کی فضیلت

فخر کی منزل، وقارِ آدمیت ہے غدیر
ہر نبی کے صبر و قربانی کی قیمت ہے غدیر
ارتقا اِک لفظِ بے مفہوم ہے اس کے بغیر
دوستو تاریخِ انسان کی ضرورت ہے غدیر

(پیام اعظمی)